معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے ۔۔۔ فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ	ہوائی ڈاک	بیس پونڈ	یا بتیس ڈالر
	بحری ڈاک	سات پونڈ	یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیی شیرستان بلڈنگ
بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف

جلد ۵۸ ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۹۶ء ۔۔۔ عدد ۶

فہرست مضامین

☆☆☆☆☆☆

شذرات

آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ۶ / دسمبر ایک بھیانک اور تاریک دن ہے۔ چار برس پہلے اسی تاریخ کو رام چندر جی کی بستی اجودھیا میں اس دور کے راونوں کے لشکر نے ایک پرانی اور تاریخی مسجد کو مسمار کر کے وہیں رام للا مندر تعمیر کر دیا جس میں ابھی تک پوجا پاٹ ہو رہی ہے۔ مسجد ڈھا کر غنڈوں اور بدمعاشوں نے جو کارسیوک کہے جاتے ہیں، پورے ملک میں فساد کی آگ بھڑکائی اور مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ اس وقت ریاست میں ایک فرقہ پرست اور فسطائی جماعت کی حکومت تھی جس کا خاص مشن ہی مسلمانوں کی تباہی کا سامان کرنا ان کے دین، ان کی تاریخ و تہذیب کو مسخ کرنا اور ان کے مقدس آثار اور متبرک یادگاروں کو مٹانا ہے۔ ۶ / دسمبر ۹۲ء کو اسے اپنا ناپاک منصوبہ پورا کرنے کے لئے مرکز کی کانگریسی حکومت اور اس کے سکیورٹی فورسیز نے کھلی چھوٹ دے دی تھی۔ افسوس ہے، دن گذرتے جا رہے ہیں مگر ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ ہونے والے اس صریح ظلم و جور اور وحشیانہ سلوک کی کوئی تلافی نہیں کی گئی۔ پھر اُس کا اعتماد جمہوریت اور سیکولرازم پر کس طرح بحال ہو سکتا ہے۔ اسی لئے ۶/ دسمبر کی منحوس تاریخ آتی ہے تو اس کا زخم ہرا ہو جاتا ہے۔ آخر وہ اپنے ساتھ ہونے والی اس زیادتی اور ناانصافی کو کیسے بھول جائے؟

بابری مسجد کا مقدمہ ۴۸ برس سے عدالت میں ہے۔ خدا جانے مسلمانوں کو کب انصاف ملے گا؟ مرکز میں دیوگوڑا کی قیادت میں حکومت بنی تو اس نے دستور کی دفعہ ۱۳۸ (۲) کے تحت یہ مقدمہ سپریم کورٹ بھیج کر جلد تصفیہ کرا دینے کا عزم ظاہر کیا، مگر اب وہ بھی چپ سادھے ہوئے ہے اور مسلم تنظیموں اور ان کے وکلا کا موقف یہ ہو گیا ہے کہ الٰہ آباد ہائی کورٹ حق ملکیت کا مقدمہ روز بروز سماعت کے ذریعہ جلد سے جلد فیصلہ کرے۔ مسلم تنظیموں نے مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ ۶/ دسمبر ۹۶ء کو نماز جمعہ تک کاروبار بند رکھیں اور نماز کے بعد مسجد کی بازیابی کے لئے دعا کریں اور اپنی بستیوں سے وزیر اعظم کو خط بھیجیں کہ حکومت اس مسئلے کو سپریم کورٹ میں دستور کی دفعہ ۱۳۸ (۲) کے تحت حل کرانے کے بجائے الٰہ آباد ہائی کورٹ میں حق ملکیت کا مقدمہ روز بروز سماعت کے ذریعہ جلد سے جلد فیصلہ کرانے کی کوشش کرے اور مسجد اپنی جگہ دوبارہ تعمیر

کرا کے مسلمانوں کے حوالے کرے۔ اس کے علاوہ صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم کو یہ میمورنڈم پیش کریں کہ دھرم سنسد کے ذریعہ متھرا کی عیدگاہ اور کاشی کی گیان واپی مسجد کو بہ زور قبضہ کرنے کی کوشش کا موثر نوٹس لیا جائے اور عبادت گاہوں کے تحفظ سے متعلق مرکزی قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔

یہ مطالبے مناسب اور معقول ہیں، بلاشبہ مسلمانوں کا یہ آئینی اور جائز حق ہے کہ وہ بابری مسجد کی بازیابی اور متھرا اور کاشی کی مسجدوں کو درپیش خطروں کے سد باب کے لئے احتجاج کریں لیکن انہیں اپنی پرامن اور آئینی جد و جہد میں جمہوریت اور سیکولرازم پر یقین رکھنے والے اور آئین و قانون کی بالادستی تسلیم کرنے والے ہندوؤں کو بھی شریک کرنا چاہئے جن کو بابری مسجد گرائے جانے کا صدمہ اور دکھ ہے۔ خود کانگریس میں بھی سب نرسمہا راؤ نہیں ہیں، ان کے جانشین برملا کانگریس کی غلطی کا اعتراف کر رہے ہیں اور مسلمانوں سے معافی مانگنے کے لئے بھی تیار ہیں، در اصل بابری مسجد کی لڑائی ہندوؤں اور مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوتوا اور سیکولرازم کی ہے۔ اس لئے فرقہ پرستوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تمام سیکولر پسندوں کا اتحاد و تعاون ضروری ہے۔ مسلمانوں کو اپنی حکمت عملی اس طرح بنانی چاہئے کہ وہ انصاف پسند ہندوؤں کی ہمدردی و تائید سے محروم نہ رہیں، اس کے علاوہ ان کو اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ وہ کیوں اتنے بے وزن اور بے وقعت ہو گئے ہیں۔ ان کے اندر وہ کون سی کمزوریاں اور خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں، جن کی بنا پر اقوام عالم انہیں نوچ کھسوٹ رہی ہیں اور وہ اتنے مجبور اور بے بس ہو گئے ہیں کہ اپنی مدافعت بھی نہیں کر سکتے۔ جس دن مسلمان اس نکتہ کو جان لیں گے، اسی دن ان کی ذلت و خواری اور ابتلا اور آزمائش ختم ہو جائے گی اور وہ اللہ کی نصرت و تائید کے مستحق ہو جائیں گے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

افسوس ہے گذشتہ مہینے میں دو دنوں کے وقفے سے ملک و ملت اور علم و دین کے دو خادم ہم سے جدا ہو گئے، جناب قاضی محمد جلیل عباسی نے طویل علالت کے بعد ۰/ نومبر کو لکھنؤ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ وہ مشہور قومی و ملی کارکن، اردو تحریک کے ممتاز رہنما اور دینی تعلیمی کونسل کے بانی قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے۔ دونوں بھائیوں نے اپنے وطن بستی (سدھارت نگر) کی ترقی و خوش حالی کے لئے

گوناگوں مفید کام کئے، قاضی جلیل عباسی بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح فرقہ وارانہ سیاست سے دور اور کانگریس سے وابستہ رہے، ان کی زندگی قومی خدمت کے لئے وقف تھی۔ ایک زمانے میں ریاستی وزیر اور پھر پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ شرافت، ہمدردی، بے لوث خدمت کے ساتھ ان کا تعلق دین و مذہب سے بھی ہمیشہ رہا، اللہ تعالیٰ قوم و ملت کے اس خادم کی مغفرت فرمائے آمین!!

دوسرا حادثہ جناب سید غلام محی الدین کی وفات کا ہے، جو بڑے خاموش، متین، متواضع اور ذی علم شخص تھے، مولانا آزاد میموریل اکیڈمی لکھنؤ کے روح رواں اور اس کے انگریزی جرنل کے ایڈیٹر تھے، وہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ کے بھی نہایت سرگرم رکن اور انگریزی کے اچھے اہل قلم تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے بڑا مخلصانہ تعلق رکھتے تھے، ان کے دینی و دعوتی کاموں میں ان کے معاون بھی تھے۔ ان کی متعدد کتابوں اور مضامین کا انگریزی ترجمہ کیا، مولانا ان کی خاموش خدمت اور علمی صلاحیت کے معترف تھے، عرصہ سے تنفس کا مرض لاحق ہوگیا تھا۔ بالآخر ۹/ نومبر کو وقت موعود آگیا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین!!

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے شائع ہونے والا سہ ماہی "فکر و نظر" ایک علمی و تحقیقی مجلہ ہے، اس کے خصوصی شماروں نے اس کی شہرت و عظمت میں چار چاند لگا دیے ہیں، ۱۹۷۸ء سے اب تک اس کے یہ خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں، ناموران علی گڈھ پر ۴ جلدیں، پہلا کارواں، دوسرا کارواں، تیسرا کارواں جلد اول، جلد دوم، سر سید نمبر، نذیر احمد نمبر، حالی نمبر، مولانا ابوالکلام آزاد نمبر، تحریک آزادی نمبر، عربی زبان و ادب نمبر اور اب شبلی نمبر۔ یہ سب نمبر بڑی اہمیت کے حامل اور علمی و ادبی دستاویز ہیں۔ جو پروفیسر نورالحسن نقوی اور پروفیسر شہریار کی ادارت میں نکلے ہیں، جن کی معاونت نائب مدیر ڈاکٹر محمد صابر کرتے رہے ہیں، وہ اب مجلہ کے اڈیٹر کی حیثیت سے بھی کام کرنے لگے ہیں۔ ان نمبروں کی صوری و معنوی خوبیوں میں ان کے ادارتی تجربہ اور انتظامی سلیقہ کا بھی خاص دخل رہا ہے۔ توقع ہے کہ ان کی محنت اور جد و جہد سے آئندہ بھی اچھے نمبر شائع ہوں گے۔ فکر و نظر کا زر سالانہ صرف ۲۰ روپے ہے۔

مقالات

شاہان مغلیہ اور سلاطین عثمانی کے عہد میں حج کے راستوں کی حفاظت کا مسئلہ×

مقالہ نگار: پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی، آکسفورڈ

ترجمہ و تلخیص: محمد اکرم ندوی، آکسفورڈ

صلح اور آشتی کی تمہاری درخواست کے جواب میں ہمارا بلیغ نامہ شاہی تمہارے پاس پہلے ہی روانہ کیا جا چکا ہے، حال میں ہندوستان سے ہمارے علاقوں میں آنے والے مسلمان حجاج اور سوداگروں کے خلاف تمہاری جارحیت کی اطلاعات موصول ہوئی ہیں، یہ ضروری ہے کہ صلح کی اپنی خواہش کی خاطر ہمارا نامہ عالی ملتے ہی ہندوستانی حجاج اور تاجروں پر ظلم و زیادتی فوراً موقوف کر دو، اگر تم اس علاقہ [ہندوستان] میں امن و امان کو مکدر کرنے سے باز نہیں آتے تو پھر تمہارے خلاف مناسب اقدامات کیے جائیں گے اور اس وقت صلح کی گفت و شنید کا وقت نکل چکا ہوگا۔ (سلیمان عالیشان بنام بادشاہ پرتگال)[1]

× یہ مقالہ انٹرنیشنل ہسٹری ریویو (سائمن فریزر یونیورسٹی، برٹش کولمبیا، کینیڈا) کی جلد ۱۰ شمارہ ۲، مئی ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔

[1] DIVAN-I-HUMAYUN MUHIMME DEFTERLERI (MD) BASHVEKALET ARCHIVES, ISTANBUL, vi.166 - دوم سباستیاؤ کے نام یہ خط ۱۶ ربیع الاول ۹۷۳ھ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۵۶۵ کو لکھا گیا، مہم دفتر لیری کے تمام حوالجات میں پہلا نمبر جلد، دوسرا نمبر صفحہ، تیسرا نمبر فرمان نمبر، چوتھا نمبر تاریخ صدور، اور پانچواں نمبر مرسل الیہ کی نشاندہی کرتا ہے۔

"مرحوم شمس الدین خاں نے اطلاع بھیجی تھی کہ فرنگیوں کی اجازت کے بغیر سمندر میں جہاز نہیں چلائے جاسکتے، مسلمان اس قدر بے بس ہوگئے ہیں کہ شاہی جہاز بھی سمندر میں سفر نہیں کرسکتے، بیس برسوں سے سورت کے سوداگروں اور سرزمین مقدس کا قصد کرنے والوں کے جہاز سمندر میں لوٹ لیے جاتے ہیں، صورت حال سے نبٹنے کے لیے علاقہ (سورت) کے فوجداروں نے جو اقدامات بھی اختیار کیے سب بے اثر ثابت ہورہے ہیں، اس معاملہ سے بے پرواہی، سستی اور غفلت غیرت اسلامی کے خلاف ہے، فرنگیوں کو اندازہ سے زیادہ مراعاتیں دی جاچکی ہیں، ملاطفت کارآمد نہیں، سختی اور صرامت کی ضرورت ہے"۔ (شہنشاہ اورنگ زیب بنام شہزادہ محمد اعظم)[1]

اسلام کے رکن کی حیثیت سے اسلامی عبادات میں حج کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ قرآن کریم نے ہر صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک بار حج فرض کیا ہے، اسی لیے ہر سال کرۂ ارض کے ہر حصہ سے بے شمار مسلمان خدا کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے وادی مکہ میں ذی الحجہ کے مہینہ میں حج کے مقدس شعائر کو ادا کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں، اس معنی میں حج عالمی اسلامی اخوت کا ایک مظہر ہے[2]۔

۱ شہنشاہ اورنگزیب، کلمات طیبات، جمع و ترتیب: عنایت اللہ خاں کشمیری، تحقیق و انگریزی ترجمہ: سید محمد عزیز الدین حسین (دہلی، ۱۹۸۲ء) ص ۱۳۹-۱۴۰۔ مزید معلومات کے لیے دیکھئے: S.H. ASKARI, MUGHAL NAVAL WEAKNESS AND AURANGZEB,S ATTITUDE TOWARDS THE TRADERS AND PIRATES ON THE WESTERN COASTS, JOURNAL OF THE BIHAR RESARCH SOCIETY (1966) ۲ ZIAUDDIN SARDAR, THE FUTURE OF HAJJ: SOME BAS C CONSIDERATIONS, ISLAMIC CULTURE (OCT. 1984) P. 308.

ہندوستان میں اسلام کی آمد کے وقت ہی سے مسلسل یہاں کے باشندوں کی ایک تعداد فریضۂ حج ادا کرتی رہی ہے، برصغیر سے مکہ مکرمہ تک سفر کرنے کے خطرات جو عہد جدید کے ہندوستان سے پہلے بہت زیادہ تھے حجاج کو حکم الٰہی: أَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ[1] کے نفاذ سے روک نہ سکے، ہندوستانی حجاج کے قافلے اہمیت اور عظمت میں مصر اور شام کے قافلوں کے مساوی شمار کیے جاتے تھے، حجاز کا سفر کرنے والے یورپ کے متعدد سیاحوں کی شہادت کے مطابق پندرہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کا قافلۂ حج مکہ مکرمہ کی معاشیات کے لیے بہت اہم سمجھا جاتا تھا[2]۔ لیکن سولھویں صدی عیسوی میں صورت حال بنیادی طور پر تبدیل ہوچکی تھی، بین الاقوامی نظام میں تبدیلیوں کے رونما ہونے سے ہندوستان سے مکہ مکرمہ جانے والے سارے راستے حصار بندی کی زد میں آگئے تھے۔

بحر ہند میں پرتگالیوں کی برتری عالمی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں میں سب سے

۱ قرآن کریم، سورہ بقرہ آیت ۱۹۶ ۲ LUDOVICO DI VARTHEMA THE ITENERARY, TRANS. J.W. JONES, IN TRAVELLERS IN DISGUISE (CAMBRIDGE, 1963) PP. 75-6, JOSEPH PITTS, AN ACCOUNT OF JOSEPH PITTS OF HIS JOURNEY FROM ALGERIS TO MECC AND MADINA IN THE RED SEA AND ABJACENT COUNTRIES AT THE CLOSE OF THE SEVENTEENTH CENTURY ED. W. FOSTER (WEISBADEN, 1967) P. 94, CHARLES J. PONCET, A NARRATIVE BY CHARLES JACQUES PONCET OF HIS JOURNEY FROM CAIRO INTO ABYSSINIA AND BACK, IBID, P. 158, A. CRICHTON HISTORY OF ARABIA (EDINBURGH, 1883), II, 234.

زیادہ منحوس تبدیلی تھی۔ ۱۵۱۵ء تک پرتگالیوں نے بحر ہند اور خلیج فارس کی اہمیت کی حامل تمام بندرگاہوں کو اپنے قبضہ میں کرلیا تھا، نتیجتاً مقدس مقامات بھی خطرے کی زد میں تھے۔[1] پرتگالیوں نے ان قدیم تجارتی شاہراہوں کے کاٹنے کی بھرپور کوششیں کیں جو ہندوستان سے خلیج فارس اور بحر احمر کے راستوں سے مشرق کے شہروں میں جاتی تھیں۔ ساتھ ہی ہندوستان سے حج کا راستہ بہت بری طرح متاثر ہوا، محفوظ گزرگاہ کی خاطر ہندوستان کے تجارتی اور حج کے جہازوں کو پرتگالیوں سے اجازت نامہ (کارتاز) لینا پڑتا تھا، جو لوگ پرتگالیوں کے اس جابرانہ فرمان کی خلاف ورزی کرتے انہیں سمندری شاہراہوں پر لوٹ لیا

---

[1] مثال کے طور پر ہندوستان میں پرتگالی علاقوں کے وائسرائے افونسو ڈی البیوکیورک نے ۱۵۱۳ء میں (نعوذ باللہ) مکہ مکرمہ پر حملہ کرنے کا ایک پروگرام بنایا تھا، ۲۰ اکتوبر ۱۵۱۴ کو اس نے شاہ دوم منویل کے پاس لکھا: "رسد اور سپلائی کی ضمانت کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے خود کو ماسوہ میں محفوظ کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ ماسوہ پریسٹر جون کے مقبوضات میں بنیادی تجارتی مرکز ہے، ان چیزوں سے فارغ ہونے کے بعد جدہ، مکہ اور سوئز کے بارے میں سوچا جائے گا، پریسٹر جون کے علاقہ میں گھوڑے کافی تعداد میں ہیں اس لیے پانچسو پرتگالی شہسواروں کے لیے آسان ہوگا کہ عمدہ کشتیوں میں سوار ہوکر جدہ میں پڑاؤ ڈالیں، پھر وہاں سے مکہ (ایک دن کا سفر) کی طرف پیش قدمی کریں اور اسے (نعوذ باللہ) خاکستر کردیں"۔ بحوالہ F.C. DANVERS, THE PORTUGUESE IN INDIA (LONDON, 1966), i. 305. البیوکیورک کے ایک دوسرے خط مورخہ ۲۵ اکتوبر ۱۵۱۴ء میں بھی مکہ مکرمہ کے خلاف اسی طرح کا مجرمانہ خیال پایا جاتا ہے، حوالہ سابق i. 306, G.W.F. STRIPLING, THE OTTOMAN TURKS AND THE ARABS (URBANA, 1942), P.30.

جاتا تھا،[1] لیکن کارتاز کا حصول ہمیشہ تحفظ کا ضامن نہیں تھا، اکثر اوقات پرتگالی ان جہازوں خصوصاً حج کے لیے جانے والے جہازوں کو کسی نہ کسی بہانے حملہ کرکے لوٹ لیتے تھے۔[2] بحری ٹکنالوجی، جدید سائنس اور آتشی اسلحوں کے میدان میں پرتگالیوں کے مقابلہ میں پیچھے ہونے کی وجہ سے ہندوستانی باشندے پرتگالی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے اہل نہیں تھے، تحفۃ المجاہدین کے مصنف شیخ زین الدین اس پر بار بار ماتم کناں نظر آتے ہیں کہ پرتگالی مسلمانوں کے اسفار خاص طور سے مکہ مکرمہ کے سفر کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔[3] شیخ زین الدین کے بیان کی پوری تائید شاہ دوم منویل (۱۴۹۵-۱۵۲۱) کی ان ہدایتوں سے ہوتی ہے جو اس نے ہندوستان میں پرتگالی مہمات کے سربراہوں کو دی تھیں، جن کو یہ آزادی تھی کہ وہ سمندری شاہراہوں پر رواں مسلمان جہازوں پر حملہ کرسکتے ہیں اور انہیں تباہ و برباد کرسکتے ہیں۔[4]

---

[1] M.N. PEARSON, MERCHANTS AND RULERS OF GUJARAT (BERKELEY, 1976) PP. 39-52, SH. ZAINUDDIN, TUHFAT AL-MUJAHIDIN, TRANS, S.M.H. NAINAR (MADRAS, 1942) P.56.

[2] مسلمان جہازرانی کے خلاف پرتگالیوں کے مظالم کے لیے ملاحظہ ہو: حوالہ سابق، ص ۵۳، ۶۰، ۶۱، ۷۰، ۷۴، ۹۲۔

[3] ZAINUDDIN, TUHFAT AL-MUJAHIDIN, P.82, PEARSON, MERCHANTS AND RULERS, P.41

[4] ZAINUDDIN, TUHFAT AL-MUJAHIDIN, P.60

[5] مسلمان جہازرانی کے خلاف پرتگالی حملوں کے لیے وجہ جواز کی فراہمی سرکاری پرتگالی واقعہ نگار کی تحریر میں موجود ہے "اپنے بحری بیڑے کی قوت سے پرتگالیوں کو سمندر کے آقا ہونے کی حیثیت سے حق حاصل ہے کہ مسلمانوں اور غیر قوموں کو جان و مال کے نقصانات سے (بقیہ حاشیہ ص ۴۱۰ پر)

مکہ مکرمہ جانے کا متبادل راستہ خشکی کا راستہ تھا، جو ایران سے گزرنے کی وجہ سے
غیر محفوظ تھا۔ ۱۵۰۱ء میں ایران میں صفوی سلطنت کے قیام اور ایرانیوں اور عثمانیوں کے
مابین مسلسل جاری رہنے والی سرحدی جھڑپوں کے نتیجہ میں راستے مسدود ہو گئے تھے اور
سنیوں کے سلسلہ میں صفویوں کی فرقہ وارانہ دشمنی نے حج کے قافلوں کی آزادانہ نقل و
حرکت کو مزید خطرناک بنا دیا تھا۔[1] ۱۵۵۶ء میں مشرق سے جانے والے حج کے راستہ کو
تیسرا دھچکا لگا جبکہ روس کے حکمران ایوان چہارم نے اصطرخان کو فتح کر کے وسطی ایشیا
سے حج کے راستہ کو جو اس شہر سے ہو کر گزرتا تھا بند کر دیا۔[2] اس طرح سلطنت عثمانیہ سے
باہر رہنے والے مسلمانوں کے لیے حج کی تمام ممکنہ گذرگاہیں یا تو مسدود تھیں یا غیر ملکی تسلط
میں تھیں۔ راہ حق کے مسافرین کو یا تو ایران میں مذہبی ظلم و تشدد کا نشانہ بننا پڑتا یا پھر پرتگالیوں

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۹) خطرہ کے ساتھ سفر کرنے پر مجبور کریں، مسلمان اور غیر قومیں عیسیٰ مسیح کے قانون کے
باہر ہیں، اس سچے قانون کے مطابق غیر قوموں کو جہنم کی آگ میں جلنا ہے بحوالہ R.S. WHIT-
-EWAY, THE RISE OF THE PORTUGUESE POWER IN IN-
DIA 1497-1550 (NEW YORK, 1967) P. 21, PEARSON,-
-MERCHANTS AND RULERS, PP. 40-41 - [1] سولھویں صدی میں
ایران کی راہ سے گزرنے والے سنیوں کے خلاف صفویوں کی فرقہ وارانہ دشمنی کی زندہ تصویر کشی
کے لیے ملاحظہ ہو: سیدی علی رئیس، مراۃ الممالک، اے ویمبری کا انگریزی ترجمہ (لندن، ۱۸۹۹)
ص ۸۲-۱۰۳ - [2] W.E.D. ALLEN PROBLEMS OF TU-
RKISH POWER IN THE SIXTEENTH CENTURY (LO-
-NDON, 1963) PP. 24-5, SIDI ALI REIS, P. 81-

کے ہاتھوں جان و مال سے ہاتھ دھو دینے کا ممکنہ خطرہ مول لینا پڑتا۔

حج کی گزرگاہوں کی حصار بندی اور حجاج کرام پر پرتگالیوں کے حملہ کے متعلق کم از کم
ہندوستان کے مغربی ساحلوں کے حکمرانوں کا ابتدائی ردعمل بے پروائی، غیر ہمدردانہ
بلکہ سنگدلانہ تھا۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس شیخ زین الدین کی شہادت موجود ہے،
انہوں نے مملوک اور عثمانی سلاطین کی مدد سے بحر ہند سے پرتگالیوں کو باہر نکالنے
کی گجرات کے سلاطین کی کوششوں کا تذکرہ کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ تاثر بھی
درج کیا ہے کہ ان کی کوششیں غیر مخلصانہ تھیں اور اس مہم کی تکمیل کے لیے ناکافی
تھیں۔[1] دوسری طرف شیخ زین الدین کالی کٹ کے ہندو راجہ سموراۓ کی ان کوششوں کو
سراہتے ہوئے نظر آتے ہیں جو اس نے پرتگالیوں کے سیلاب کو روکنے اور مسلمانوں کی
جان و مال کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے کی تھیں شیخ زین الدین اس ہندو راجہ کو مسلمانوں کا
دوست بتاتے ہیں، سموراۓ کی غیر ملکی جارحیت کے خلاف مشترکہ اقدام کی تجویز کے سلسلہ
میں مسلمان حکمرانوں کی بے پرواہی کا تذکرہ کرنے کے بعد شیخ زین الدین اپنے رنج کا اظہار
کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں" سموراۓ نے مسلمان حکمرانوں کے پاس خفیہ خطوط بھیجے اور
ان سے درخواست کی کہ پرتگالیوں کے خلاف جنگ کی تیاری کریں، لیکن کوئی مسلمان
حکمراں اس کے لیے تیار نہیں تھا کہ دشمن کے ساتھ جنگوں میں ملوث ہوئے[2] پرتگالیوں کے

---

[1] ZAINUDDIN, TUHFAT AL-MUJAHIDIN, PP. 56-8, 75, 87-8

[2] مندرجہ بالا حوالہ ص ۶۳، شیخ زین الدین کا یہ تبصرہ قابل ذکر ہے کہ: "مسلمان سلاطین اور امراء کبھی ملیبار
کے مسلمانوں کے مسائل سے کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کرتے، حالانکہ جہاد ان پر فرض ہے" ص ۲۲، شیخ
زین الدین کی رائے گجرات کی تجارت پر پرتگالیوں کے حملوں کے سلسلہ میں سلاطین (بقیہ حاشیہ ص ۴۱۲ پر)

خلاف مسلمان حکمرانوں کی بیرونی امداد کے حصول کی خواہش کے باوجود ایک اندرونی طاقت کے ساتھ اشتراک کے سلسلہ میں تردد ایک عجیب تضاد ہے۔ شاید یہ سمجھا جا رہا تھا کہ عثمانی سلطنت کے ساتھ تعاون شہرت اور قوت کا باعث ہوگا جبکہ ایک معمولی ہندو راجہ کے ساتھ اتحاد نامناسب اور ذلت آمیز محسوس ہو رہا تھا[1]۔

سولھویں صدی کے نصف اول میں حج کے راستہ کے مسئلہ کے متعلق شمالی ہند کے مسلم حکمرانوں کے رویہ پر زیادہ معلومات میسر نہیں ہیں۔ ہندوستان میں صرف دوسری افغان سلطنت کے بانی شیر شاہ سوری (۱۵۴۰-۱۵۴۵) کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس مسئلہ کو کوئی اہمیت دی، ۱۵۴۴ء میں اس نے مشہور محدث سید رفیع الدین کی سربراہی میں ایک سفارت استنبول بھیجنے کا فیصلہ کیا، اس سفارت کا مقصد تھا کہ قزلباش (ایرانیوں) کے خلاف عثمانی سلطان کے ساتھ ایک اتحاد قائم کیا جائے، کیونکہ ایرانی مکہ مکرمہ جانے والے حج کے قافلوں کی پیش رفت کی مخالفت

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۱) گجرات کے موقف کے سلسلہ میں ایم این پیرسن کے تجزیہ کے مطابق ہے، اس کا خیال ہے کہ سلاطین گجرات کے پاس پرتگالیوں کے خطرہ کو ختم کرنے کے بہترین مواقع حاصل تھے، لیکن انہیں سوداگروں کی پرواہ نہیں تھی (MERCHANTS AND RULERS, P.2) [1] لگتا ہے کہ بعد میں سولھویں صدی میں کالی کٹ کے راجہ کے سلسلہ میں مسلمان حکمرانوں نے اپنی پالیسی پر نظر ثانی کی، ۱۵۷۱ء میں بیجاپور کے سلطان اور کنور کے علی راجہ نے پرتگالیوں کے خلاف سموراۓ کے ساتھ ایک اتحاد قائم کیا، لیکن احمد نگر کے سلطان کی بدعہدی کی وجہ سے گوا سے پرتگالیوں کو باہر نکالنے کی ان کی متحدہ کوشش سبوتاژ ہوگئی (ZAINUDDIN, TUHFAT AL-MUJAHIDIN. PP. 84-87)

کر رہے تھے اور مذہبی تعصب کو ہوا دے رہے تھے[1] شیر شاہ ایران پر افغانیوں اور عثمانیوں کے مشترکہ حملہ کا منصوبہ بنا رہا تھا، اسے یقین تھا کہ افغان شہسواروں اور عثمانی توپوں کا اشتراک صفویوں کے خاتمہ اور نتیجتاً مکہ مکرمہ کے خشکی راستوں کے آزاد ہونے کو یقینی بنا دے گا، وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ مقدس شہروں میں سے کسی ایک کی حکومت میں اسے حصہ مل جائے گا[2] لیکن یہ منصوبہ عمل میں نہ آسکا، ۱۵۴۵ء کی کالنجر کی مہم کے اثنا میں اچانک شیر شاہ کا انتقال ہوگیا اور میر رفیع الدین کی سفارت پھر کبھی روانہ نہ ہوسکی۔ موجود شہادتیں اشارہ کرتی ہیں کہ عثمانیوں کے ساتھ شیر شاہ کے صفوی مخالف اتحاد کے پیچھے ایرانیوں کے چنگل سے حج کے راستوں کی آزادی کی مخلصانہ خواہش سے زیادہ شاہ طہماسپ کی دشمنی کارفرما تھی[3] بہرحال سولھویں صدی کا واقعہ نگار

---

[1] عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، انگریزی ترجمہ (دلی، ۱۹۷۳) ۱/۴۸۰ [2] حوالہ سابق ۱/۴۸۰-۴۸۱، نیز RIAZUL ISLAM, INDO-PERSIAN RELATIONS: A STUDY OF THE POLITICAL AND DIPLOMATIC RELATIONS BETWEEN THE MUGHAL EMPIRE AND IRAN (TEHRAN, 1970), PP. 202-3. [3] شیر شاہ کے معاصر اور تاریخ دولت شیر شاہی کے مصنف حسن علی خان کا بیان ہے: افغان بادشاہ نے شاہ طہماسپ کے پاس ایک سفیر بھیجا کہ ہمایوں کو اپنے مقبوضات سے باہر نکال دے، شاہ طہماسپ نے صرف درخواست ہی مسترد نہیں کی بلکہ سفیر کے ناک اور کان کاٹ دیئے، اس کے جواب میں شیر شاہ نے کئی ایرانیوں کے ناک کان کٹوا دیئے اور سارے ایرانیوں کو اپنی سلطنت سے باہر نکال دیا (ISLAM, INDO-PERSIAN RELATIONS, P. 202) شاید اسی حادثہ کے بعد شیر شاہ نے عثمانیوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنا چاہا، ایران کے خلاف شیر شاہ کے مجوزہ حملہ کے پیچھے شاہ طہماسپ سے اس کی دشمنی کارفرما تھی۔

بدایونی شیر شاہ کی مخلصانہ نیت کی تعریف کرتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ قیامت کے دن شیر شاہ کا یہ اقدام اس کی نجات اخروی کا ذریعہ ہوگا[1]

اکبر (۱۵۵۶-۱۶۰۵) پہلا مغل بادشاہ تھا جس نے سنجیدگی سے حج کے راستہ کے مسئلہ پر توجہ دی، ۱۵۷۳ء میں گجرات کی فتح کے بعد اکبر کے لیے قریب سے پرتگالیوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لینا آسان ہوگیا اور اسے پرتگالیوں کے خطرہ کی سنگینی کا بخوبی اندازہ ہوگیا۔ اس کی ذاتی پریشانی میں اس وقت اضافہ ہوگیا جبکہ حج کے لیے جانے والی اس کے حرم کی خواتین نے روانگی میں تردد کا اظہار کیا۔ صورت حال اس قدر خراب ہوگئی تھی کہ عہد اکبری کے ایک ممتاز عالم نے فتویٰ دے دیا کہ خشکی کے راستہ جانے والے حاجیوں پر ایرانیوں کے ذریعہ پیش آنے والے ظلم و ستم اور بحری راہ سے جانے والے حاجیوں پر پرتگالیوں کے ہاتھوں پیش آنے والے مظالم کے پیش نظر ہندوستانی مسلمانوں پر حج کی فرضیت باقی نہیں رہی،[2] بظاہر

---

[1] منتخب التواریخ ۱/ ۴۸۱ [2] یہ فتویٰ مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری نے دیا تھا، ملاحظہ ہو: منتخب التواریخ ۲/ ۲۰۶، عزیز احمد نے اپنی کتاب اسٹڈیز ان اسلامک کلچر ... مطبوعہ آکسفورڈ، ۱۹۶۴ء ص ۲۹-۳۰ میں ملا عبداللہ کو اکبر کا شیخ الاسلام لکھا ہے، یہ بیان غلط ہے، اکبر کے عہد میں وہ کبھی اس عہدہ پر فائز نہیں ہوئے، بدایونی کے مطابق ملا کو مخدوم الملک اور شیخ الاسلام کے خطابات سے ہمایوں نے نوازا تھا، ملا عبداللہ کے مختصر حالات زندگی کے لیے ملاحظہ ہو: منتخب التواریخ ۳/ ۱۱۳-۱۱۸۔ عہد مغلیہ میں شیخ الاسلام کے ادارہ کے لیے ملاحظہ ہو: RAFAT M. BILGRAMI, RELIGIOUS AND QUASI-RELIGIOUS DEPARTMENTS OF THE MUGHAL PERIOD: 1556-1707 A.D. (MUNSHIRAM MANOHAR LAL, 1884), PP. 1-58-

فوری اقدام ضروری تھا، لیکن اکبر کیا اقدام کر سکتا تھا؟ اس کے لیے پرتگالیوں کا مقابلہ کرنا مشکل تھا، کیونکہ اس کے پاس کوئی بحری بیڑہ نہیں تھا اور پرتگالیوں کی بحری غارتگریوں کو صرف خشکی کے کسی اقدام کے ذریعہ روکنا تقریباً ناممکن تھا، چونکہ ایک بڑی حد تک ہندوستانی حجاج اور سوداگروں کا تحفظ پرتگالیوں کے ساتھ صلح کرنے پر منحصر تھا اسلیے کم از کم وقتی طور پر اکبر کے سامنے اقدام کی یہی ایک راہ تھی۔

۱۵۷۳ء میں ایک معاہدہ صلح پر دستخط ہوئے، مغلوں نے معاہدہ کیا کہ پرتگالیوں کے مستقل دشمن ملیبار قزاقوں کو پناہ نہیں دیں گے، جس کے عوض میں پرتگالیوں نے بحر احمر میں ہر سال ایک شاہی جہاز کو مفت کارتاز دینے کا عہد کیا[1]۔ یہ معاہدہ ایک برتر بحری طاقت کے مقابلہ میں مغلوں کی بے بسی کا غماز اور بحر ہند میں پرتگالیوں کی برتری کے اعتراف کے مترادف ہے۔ ایم این پیرسن لکھتے ہیں: "اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مغل شہنشاہ نے اپنی عظمت کو متاثر کرنے والی کسی ایسی چیز کو قبول کیا ہو"[2]۔ اس ذلت آمیز صلح کے باوجود حج کے راستوں پر غارتگری برقرار رہی ۱۵۷۵ء میں اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم کو مکہ مکرمہ کے سفر کے لیے کارتاز کے حصول کی خاطر گجرات کے ایک گاؤں بتسار سے دستبردار ہونا پڑا۔ اسے ایک سال کے بعد سفر کرنے کی اجازت ملی[3]۔ اگلے سال حج کے شاہی قافلہ

---

[1] PERRSON, MERCHANTS AND RULERS, P. 83, DANVERS, THE PORTUGUESE, ii. 4 [2] PEARSON, MERCHANTS AND RULERS, P. 84 [3] منتخب التواریخ ۲/ ۲۱۴ - V. SMITH AKBAR THE GREAT (DELHI, 1958) P. 145, S. J. MONSERRATE THE COMMENTARY OF FATHER MONSERRATE ON HIS -

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱۶ پر)

کو سورت میں روک دیا گیا، ابوالفضل لکھتا ہے کہ حجاج پرتگالیوں سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ جہاز پر سوار ہونے کے لیے تیار نہیں ہو رہے تھے اور شاہی افسران کی ہمت افزائی ان کے لیے کسی قسم کی یقین دہانی کرانے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ یہ دہشت باقاعدہ کارتاز کی غیر موجودگی کی وجہ سے تھی، سورت کے گورنر کے بروقت اقدام اور ضروری اجازت نامہ کے حصول کے بعد ہی کافی تاخیر سے جہاز جدہ کے لیے روانہ ہو سکا[۱]۔ پرتگالی ایک بار پھر مکہ معظمہ کے راستہ پر اپنے تسلط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

اکبر نے حج کے راستہ پر پرتگالیوں کے جابرانہ تسلط کو توڑنے کی متعدد کوششیں کیں، ۱۵۷۷ء میں اس نے عبداللہ خاں ازبک کو خبر کی کہ وہ ہندوستان میں فرنگیوں (پرتگالیوں) کی آبادیوں پر حملہ کرنا چاہتا ہے، اکبر نے زور دیا کہ اس حملہ کا مقصد یہ ہے کہ مکہ معظمہ کے بحری راستہ کو پرتگالیوں کے خطرات سے محفوظ کر دیا جائے[۲]۔ تین سال بعد ۱۵۸۰ء میں اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا گیا جبکہ قطب الدین خاں کو پرتگالی بندرگاہوں پر قبضہ کرنے کی مہم سونپی گئی، مالوہ اور گجرات کے شاہی افسران اس کی

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۵) JOURNEY TO THE COURT OF AKBAR, TRANS. J. S. HOYLAND AND S. N. BANARJEE (CALCUTTA, 1922) P. 166, GULBADAN BEGUM, HUMAYUN NAMA TRANS. A. S. BEVERIDGE (LONDON, 1902) P. 72

[۱] ابوالفضل، اکبرنامہ، ایچ بیورج کا انگریزی ترجمہ (دہلی ۱۹۷۲) ۳/ ۲۷۵-۲۷۷، منتخب التواریخ ۲/ ۲۴۹، نظام الدین احمد، طبقات اکبری، بی ڈی کا انگریزی ترجمہ (کلکتہ، ۱۹۳۶-۱۹۳۹) ۲/ ۴۶۹ [۲] ISLAM, INDO-PERSIAN RELATIONS, P.53 - یہ خط مغل سفیر مرزا فولاد کے ذریعہ بھیجا گیا تھا۔

کمانداری میں تھے اور دکن کے حکمرانوں کو اطلاع کر دی گئی تھی کہ اس سمت میں ان فرنگیوں کو ختم کرنے کے لیے فوجیں بھیجی جا رہی ہیں جو حجاز کے مسافرین کے راستوں کو مسدود کیے ہوئے ہیں[۱]۔ اہل دکن کو یہ احکام دیے جانے کے باوجود کہ وہ شاہی فوج کے ساتھ تعاون کریں یہ مہم ناکام رہی، بھاری نقصانات کے ساتھ قطب الدین کو پیچھے ہٹنا پڑا[۲]، ہمت نہ ہارتے ہوئے اکبر اب بھی پرتگالیوں کو باہر نکالنے کا خواب دیکھ رہا تھا، ۱۵۸۶ء میں پھر اس نے عبداللہ خاں سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ فرنگی کافروں کو نیست و نابود کرنا چاہتا ہے جنھوں نے سرکشی کا سر بلند کر رکھا ہے اور مقدس مقامات کے زائرین پر دست ظلم دراز کر رکھا ہے[۳]۔ آیندہ سال بخارا میں مغل سفیر حکیم ہمام کو پرتگالی جزیروں کو فتح کرنے کے ایک منصوبہ کی خبر کی گئی[۴]۔ اس منصوبہ کو کبھی عملی جامہ نہیں پہنایا گیا، کسی بھی مغل یا پرتگالی واقعہ نگار نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے، لیکن پرتگالیوں کو ہندوستان سے باہر کرنے کی اکبر کی خواہش ختم نہیں ہوئی، ۱۶۰۱ء میں اس نے اعلان کیا کہ دکنی سلطنتوں کی فتح پرتگالی

---

[۱] اکبرنامہ ۳/ ۴۱۰ [۲] مونزریٹ کے بیان کے مطابق قطب الدین خاں نے پندرہ ہزار کی ایک مضبوط فوج کے ساتھ دشمن کے خلاف پیش قدمی کی تھی، اس نے مضافاتی علاقوں کو تباہ بھی کیا تھا لیکن دشمن کے حاکم نے اسے شکست دے دی (COMMENTARY, PP. 168-9) دینورس کا بیان ہے کہ دشمن پر حملہ کیے بغیر قطب الدین خاں واپس چلا گیا۔ (THE PORTUGUESE, ii. 42-3) نیز ملاحظہ ہو: M. S. COMMISSARIAT, HISTORY OF GUJARAT (AHMADABAD, 1980) iii. 65-70, V. SMITH AKBAR THE GREAT, PP. 145-6. [۳] اکبرنامہ ۳/ ۷۵۸، ابوالفضل، مکتوبات علامی (لکھنؤ، ۱۸۶۳) ص ۲۳ [۴] : ص ۱۹۶-۱۹۸

علاقوں کو ہندوستان کے ماتحت کرنے کی راہ ہموار کر دے گی[1]

۱۵۸۱ء کے بعد جبکہ اکبر کے مذہبی اعتقاد میں انحراف پیدا ہو چکا تھا، حاجیوں کی آزادانہ گزرگاہ کے لیے اس کی فکرمندی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے لیکن پرتگالیوں کے خلاف اکبر کی پالیسی کی تشکیل میں سیاسی مقاصد بھی اسی قدر کارفرما تھے۔ اس کا خیال تھا کہ پرتگالی جارحیت پسند ہیں، ہندوستانی سمندروں پر ان کا تسلط اس کی عظمت کے خلاف ایک چیلنج اور اس کی عزت پر حملہ ہے۔ پیرسن کی رائے ہے کہ اکبر نے پرتگالیوں پر یہ دباؤ نہیں ڈالا کہ وہ پاس سسٹم (کارتاز) ختم کریں کیونکہ وہ اسے اپنے اقتدار عالی کی بے حرمتی نہیں تصور کرتا تھا۔[2] پیرسن کا خیال کسی صحیح بنیاد پر نہیں قائم ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے کئی بار پرتگالیوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کا منصوبہ بنایا، لیکن طاقتور بحری بیڑہ کی عدم موجودگی سے اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور اس کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

لیکن اکبر نے کبھی مکہ مکرمہ کے بری راستے پر ایرانیوں کی حصاربندی کو چیلنج نہیں کیا۔ عبداللہ خاں ازبک نے اس سے دوبارہ درخواست کی کہ حاجیوں کے راستہ کو آزاد کرانے کے لیے ایران کے خلاف اس کے ساتھ اتحاد کرے، لیکن دونوں موقعوں پر اکبر نے کوئی حرکت نہیں کی۔ اس نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ گجرات کی فتح کے بعد مکہ مکرمہ کا بحری راستہ کھل گیا ہے اور حج کے راستہ کی ساری رکاوٹیں دور ہو گئی ہیں۔ ایران کے

[1] PIERRE DUJURIC, AKBAR AND THE JESUITS, TR-ANS. G.H. PAYNE (LONDON, 1926) PP. 112-13

[2] PEARSON, MERCHANTS AND RULERS, P. 84.

خلاف تینوں سنی طاقتوں (عثمانی، ازبک اور مغل) کے اتحاد کی تشکیل کی ازبکوں کی تجویز کے جواب میں اکبر نے اس کے برعکس یہ تجویز رکھی کہ عثمانیوں کے خلاف ایرانیوں کی مدد کی جائے[1]۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اکبر ایرانیوں کے ساتھ بہترین دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا، بلکہ اس نے ایسا صرف سیاسی عوامل کی بنا پر کیا، ایران کی شکست سے ازبک کی طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو سکتا تھا جس کے نتیجہ میں افغانستان کے مغل علاقے ازبک خطرہ کی زد میں آ سکتے تھے، اس لیے ایران کے علاقائی اتحاد کو برقرار رکھنا سلطنت مغلیہ کے مفاد میں تھا، نتیجتاً عملی طور پر مکہ مکرمہ کے خشکی کا راستہ مسدود رہا اور سیاست کو مذہب پر ترجیح حاصل رہی۔

۱۶۰۵ء میں جہانگیر کی تخت نشینی سے کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی۔ صرف ایک بار اس نے پرتگالیوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کی ایک سنجیدہ کوشش کی، یہ اس وقت ہوا جبکہ پرتگالیوں نے ۱۶۱۳ء میں حج کے ایک جہاز رحیمی پر قبضہ کر لیا، جس میں حجاج بڑی تعداد میں تھے اور ایک لاکھ پاؤنڈ کی مالیت کا سامان تھا، سامان لوٹ لیا گیا اور

[1] اکبر نامہ ۳/ ۷۵۸، ابوالفضل مکتوبات علامی ص ۲۳-۲۴۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایران کے سنی بادشاہ شاہ اسمٰعیل دوم (۱۵۷۶-۱۵۷۸) کے مختصر عہد میں سنی حجاج کے لیے مکہ مکرمہ کا راستہ کھلا ہوا تھا، مرزا حکیم کے نام ایک خط میں شاہ اسمٰعیل نے ذکر کیا کہ راستہ کھلا ہوا ہے اور مرزا کو ایران کے راستہ سے گزرنے والے حجاج کی آزادی اور تحفظ کی یقین دہانی کی اور اس سے درخواست کی کہ حجاج کی روانگی کی ہمت افزائی کرے، ملاحظہ ہو: R. ISLAM, CALENDAR OF DOCUMENTS ON INDO-PERSIAN RELATIONS 1500-1750 (TEHRAN AND KARACHI, 1979) i. 100.

حجاج کرام کو گرفتار کر لیا گیا۔[1] اس کے جواب میں جہانگیر نے حکم دیا کہ مغل علاقوں میں موجود سارے پرتگالیوں کو گرفتار کر لیا جائے، ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں، ان کے گرجاگھر بند کر دیے گئے، ان کے مذہب پر پابندی لگا دی گئی، گرجاگھر کے پادریوں کو حکومت کی جانب سے دیے جانے والا روزینہ بند کر دیا گیا اور جیسوٹ پادری جیروم ایکسیور اگرچہ جہانگیر کا دوست تھا اسے ذلت کے ساتھ سورت روانہ کر دیا گیا، سورت کے گورنر مقرب خاں کی قیادت میں ایک مغل فوج نے دمن پر حملہ کر دیا، جہانگیر کی ہدایت پر احمد نگر کے سلطان نے باسین کا محاصرہ کر لیا اور بڑھتے ہوئے پرتگالی بیڑہ کو تباہ کرنے کے لیے انگریزوں اور ڈچوں کے تعاون کے حصول کی ناکام کوشش کی گئی۔[2]

---

[1] LETTERS RECEIVED BY THE EAST INDIA COMPANY FROM ITS SERVANTS IN THE EAST ED. W. FOSTER (LONDON, 1897-1902) ii. 96, 213, 247, 251 بعد میں رحیمی جہاز کے ساز و سامان کا تخمینہ ایک لاکھ تیس ہزار پاؤنڈ کیا گیا (IBID, P.251) ستمبر ۱۶۱۴ میں پرتگالیوں نے سورت کا ایک اور جہاز لوٹ لیا (IBID, P.104) جہانگیر کا بیان ہے کہ ان لوگوں نے چار جہازوں پر قبضہ کر لیا تھا: "اسی مہینہ خبر آئی کہ گوا کے فرنگیوں نے صلح نامہ کے برعکس چار سامان بردار جہازوں کو جو سورت کی بندرگاہ پر آتے جاتے رہتے تھے بندرگاہ کے قریب لوٹ لیا، مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو قیدی بنا لیا اور جہازوں کے مال و متاع پر قبضہ کر لیا (شہنشاہ جہانگیر: تزک جہانگیری انگریزی ترجمہ (دہلی ۱۹۶۹) ۱/ ۲۵۵) [2] LETTERS RECEIVED, ii 96, 97, 107, 149-50, 171, 213, 246, TUZUK-I-JAHNNGIRI (ENGLISH TRANSLATION) i, 256 COMMISSARIAT GUJARAT iii. 70-1, DANVERS THE PORTUGUESE, ii. 166-8

لیکن یہ مہم ۱۵۸۰ء کی مہم کی طرح ناکام ہو گئی، ۱۶۱۵ء میں صلح اور دوستی کا ایک معاہدہ کیا گیا اور پرتگالیوں کو تباہ کرنے اور حجاج کے لیے محفوظ راستہ کھولنے کا جہانگیر کا منصوبہ ختم ہو گیا۔[1]

ایران کے شاہ عباس اول کے ساتھ جہانگیر کے گہرے اور دلی تعلقات کے پیش نظر جہانگیر خشکی کے راستہ جانے والے ہندوستانی حجاج پر کیے جانے والے مظالم کو نظر انداز کرتا رہا، لیکن ۱۶۲۲ء کے بعد جبکہ ایرانیوں نے مغلوں کے ہاتھ سے قندھار چھین لیا جہانگیر نے ایران پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنانا شروع کیا۔ اس نے ازبکوں کے ساتھ سفارتی تعلقات کا احیا کیا اور نتیجتاً مغل ازبک مراسلات نے اس ضرورت پر زور دیا کہ حج کے راستہ کو ایرانیوں سے آزاد کیا جائے۔[2] اس نے

---

[1] H. HERAS, JAHANGIR AND THE PORTUGUESE, PROCEEDINGS OF THE INDIAN HISTORICAL RECORDS COMMISSION, IX (1962) 25-30, COMMISSARIAT, GUJARAT, iii. 75-9, DANVERS, PORTUGUESE, ii. 173-4 ۔ صلح کی شرائط کے مطابق پرتگالی رحیمی جہاز کے لوٹے جانے پر معاوضہ ادا کرنے کے پابند تھے، انھوں نے اس سے بھی اتفاق کیا کہ دو سالوں کے لیے مکہ مکرمہ جانے والے مزید دو جہازوں کو پاس فراہم کریں گے، یہ سالانہ ایک مغل جہاز کو پاس دیے جانے کے علاوہ تھا، ۱۶۱۸ سے ۱۶۲۳ کے دوران کارتازے کے حصول کی جہانگیری درخواستوں کے سلسلہ میں معلومات کے لیے ملاحظہ ہو: HISTORICAL ARCHIVES OF GOA CONSULTAS DO SERVICO, iii, 50, 70-1, 82, 107-8, 118-19. [2] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: جہانگیر کے نام امام قلی خاں کا خط، خواجہ کامگار حسینی غیرت خاں ماثر جہانگیری، ترتیب: عزرا علوی (بمبئی ۱۹۷۸) ص ۲۴۹-۵۳، ۵۲۸-۲۹۔

عثمانی سلطان مراد چہارم کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا کہ ایرانیوں کے خلاف عثمانیوں اور مغلوں کی ایک مشترکہ مہم کا آغاز کیا جائے[1] ایران کے خلاف سنی طاقتوں کے سہ طرفہ اتحاد کی گفت وشنید جاری ہی تھی کہ ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کے انتقال پر یہ منصوبہ اس کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔

اس کا جانشین شاہجہاں شروع میں ہندوستان کی پرتگالی آبادیوں کو فتح کرنے پر زیادہ مصر نظر آتا ہے۔ گوا کے وائسرائے کے پاس ایک خط میں اس نے مغل جہازوں پر ہونے والے پرتگالی حملوں کے سلسلہ میں اپنے غم وغصہ کا اظہار کیا، نقصانات کے معاوضہ کا مطالبہ کیا اور اس کی عدم ادائیگی کی شکل میں سنگین نتائج سے آگاہ کیا[2] ۱۶۲۸ء میں اس نے انگریزوں کے سامنے تجویز رکھی کہ دمن اور دیو کے خلاف مشترک مہم جوئی کی جائے، سورت کی انگلش فیکٹری کے صدر رچرڈ وائلڈ نے لندن خط لکھا کہ "بادشاہ (شاہجہاں) اپنے مقبوضوں سے سارے پرتگالیوں کو ختم کرنا چاہتا ہے، اس کی تجویز ہے کہ وہ آپ کی فوجوں کی مدد سے دیو کے خلاف پیش قدمی کرے[3]"، ان کی خدمات کے

---

[1] احمد فریدون بی، منشأت السلاطین (استنبول، ۱۸۴۸-۴۹) ۲/۱۴۲-۴۳
[2] HAGUE TRANSCRIPTS, SERIES I, VOL. IX, NO. 296, IN W. FOSTER, THE ENGLISH FACTORIES IN INDIA 1624-1629 (ED. OXFORD, 1906-27, P. 329 N.I.
[3] THE ENGLISH FACTORIES IN INDIA 1624-1629, PP. 326-7 328, 336: THE ENGLISH FACTORIES IN INDIA 1630-1633, PP. 33. 38_

صد میں انگریزوں کو مغل مقبوضات میں زبردست تجارتی مراعات دینے کی پیش کش کی گئی، لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجویز مسترد کردی اور وائلڈ کو واپس بلا لیا گیا۔ اس کے جانشین تھومس راسٹل نے اس اسکیم میں کسی قسم کی دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا اور نئی مغل تجویزیں آنے تک اس معاملہ میں سرد مہری برتی، اس طرح یہ منصوبہ ناکام ہوگیا۔

۱۶۳۹ء میں انگریزوں کے بجائے ڈچ کی مدد سے دمن پر قبضہ کرنے کی ایک دوسری کوشش کی گئی، لیکن جب ڈچوں نے دمن کا محاصرہ کرنے سے انکار کردیا[1] تو شاہزادہ اورنگزیب نے جو اس وقت دکن کا وائسرائے تھا یہ یقین کرتے ہوئے کہ صرف فوجی کارروائی سے قلعہ کو تابع نہیں کیا جاسکتا ہے، سورت کے گورنر میر موسیٰ اور انگلش فیکٹری کے صدر ولیم فریملن کے مشورہ پر پرتگالیوں کے ساتھ صلح کرلی[2]۔ پرتگالیوں نے مغلوں کو سالانہ ٹیکس دینے سے اتفاق کیا، اس طرح دمن ایک بار پھر مغل سلطنت کے دائرہ میں آنے سے بچ گیا اور حج کے راستہ پر یورپ کا تسلط برقرار رہا۔

---

[1] THE ENGLISH FACTORIES IN INDIA 1637-1641, PP. 240, 214, 124, 123, 281, 316, 216, 124-5
[2] انگلش فیکٹری کے ریکارڈز کے مطابق دمن پر مغلوں کے حملہ کے بعد پرتگالیوں نے کھمبایت جانے والے سورت کے جہازوں پر پابندی لگادی تھی اور مغل بندرگاہوں سے روانہ ہونے والے جہازوں کو پاس دینے سے انکار کردیا تھا، نتیجتاً سورت کی تجارت متاثر ہوئی اور کسٹم کی آمدنی میں کمی ہوگئی جس سے سورت کے گورنر کو نقصان ہوا انگریزوں کو بھی مغل ڈچ معاہدہ سے کافی تشویش تھی THE ENGLISH FACTORIES IN INDIA 1637-1641, PP. 123-5, COMMISSARIAT, GUJARAT, iii. 80-6,

ایران کے ساتھ شاہجہاں کے تعلقات پر زیادہ تر قندھار پر دوبارہ قبضہ کرنے کی خواہش کارفرما رہی۔ اس نے ۱۶۳۸ء میں قندھار پر قبضہ کر لیا لیکن دس سال بعد پھر یہ علاقہ ایرانیوں کے ہاتھ میں آگیا، شاہجہاں نے بھی ایران کے راستہ سے حاجیوں کے پُرامن اور محفوظ سفر کے لیے کوئی کوشش نہیں کی، ازبک اور عثمانیوں کے ساتھ اس کی مراسلات میں حج کے کسی حوالہ کی عدم موجودگی اس مسئلہ سے اس کی لاتعلقی کی گواہ ہے۔ اس کے عہد حکومت میں بھی خشکی کا راستہ ایرانیوں کے زیر اقتدار رہا۔

۱۶۵۸ء میں اورنگزیب کی تخت نشینی کے وقت بحر ہند میں طاقت کا توازن بنیادی طور پر تبدیل ہو چکا تھا، پرتگالیوں کی طاقت کمزور پڑ چکی تھی، اور انگریزوں اور ڈچوں نے مضبوطی کے ساتھ مغربی ہند میں خود کو مستحکم کر لیا تھا، اگرچہ پرتگالی اب بھی تمام سمندروں پر اپنی بالادستی کے دعویدار تھے اور ہندوستانی جہاز اب بھی کارتازے جاتے تھے لیکن ہندوستانی جہازوں پر پرتگالیوں کے حملوں میں واضح طور پر کمی آگئی تھی۔ اب پرتگالی مغلوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لیے فکرمند تھے، ۱۶۶۷ء میں انہوں نے مراٹھوں کے خلاف ایک مہم میں مغلوں کی مدد بھی کی[1] اور ۱۷۰۲ء میں پرتگالی بادشاہ گوا کے وائسرائے کو ہدایت کر رہا تھا کہ "اس (اورنگزیب کی دوستی برقرار رکھنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے خواہ حکومت کو اس کی کوئی قیمت ادا کرنی پڑے۔ اس سلسلہ میں جو خرچ بھی ہوگا اس کا جواز موجود ہے کیونکہ اس سے ہماری تباہی رک سکتی ہے"[2]

[1] H. HERAS, A TREATY BETWEEN AURANGZEB AND THE PORTUGUESE. PIHRC, X (1927), 45.

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲۵ پر)

اگرچہ پرتگالیوں کا زوال شروع ہو چکا تھا لیکن ہندوستان سے حج کے راستہ میں اسی طرح کا ایک اور منحوس خطرہ ان کی جگہ لے رہا تھا، بحر ہند میں یورپی قزاقوں کی ایک نئی نسل کا تسلط ہو چکا تھا، جس کی قزاقی ایک لمبی مدت پر حاوی ہے، اس کی ابتدا پندرہویں صدی کے آخر میں واسکوڈیگاما کے آنے سے شروع ہوتی ہے، ایک صدی کے بعد انگریزوں، ڈچوں اور فرانسیسیوں کے آنے سے اس میں اور شدت پیدا ہوگئی، جدہ اور موچہ سے قیمتی تجارتی سرمایوں کے ساتھ واپس ہونے والی تجارتی اور حج کی ہندوستانی سواریاں ان کا خصوصی نشانہ تھیں[1]۔ مثال کے طور پر ۱۶۱۲ء میں انگریز قزاقوں نے بحر احمر میں متعدد ہندوستانی جہازوں کو لوٹ لیا تھا[2] اور ۱۶۲۳ء میں ڈچ قزاقوں نے اودھم مچا رکھی تھی لیکن اورنگزیب (۱۶۵۸-۱۷۰۷) کے عہد میں یورپین قزاقی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، اس کی تخت نشینی کے فوراً بعد مکہ مکرمہ سے واپس ہونے والا ایک جہاز سورت کے قریب پکڑ لیا گیا، سامان لوٹ لیا گیا اور متعدد خواتین کی بے حرمتی کی گئی[3] (باقی)

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲۴) [2] COMMISSARIAT, GUJARRT, iii. 436 سنہ ۱۶۹۱ء میں پرتگالیوں کے خلاف مغل مہم جوئی اور مغلوں سے دوستی کرنے کی پرتگال کے وائسرائے کی خواہش کے لیے ملاحظہ ہو، محمد ہاشم خوافی خاں منتخب اللباب (کلکتہ ۱۸۹۶-۱۹۲۵) ۲/ ۴۰۰-۳ [1] خوافی خاں نے انگریز قزاقوں کی چال کا مفصل نقشہ کھینچا ہے: "ہندوستانی سامانوں سے لدے ہوئے جہاز جب موچہ اور جدہ کی بندرگاہوں کی طرف بڑھتے ہیں تو یہ ان کے ساتھ دخل اندازی نہیں کرتے لیکن جب یہ جہاز سونا، چاندی، ابراہیمی اور ریال لے کر لوٹتے ہیں تو ان کے جاسوس خبر دیدیتے ہیں کہ کس جہاز پر سب سے زیادہ قیمتی اشیا ہیں اور وہ اس پر حملہ کر دیتے ہیں، منتخب اللباب ۳/ ۲۲۸ [2] JAGDISH N. SARKAR, THE RAPE OF INDIAN SHIPS IN INDIAN WATERS, 1612, JOURNAL OF THE BIHAR RESEARCH SOCIETY, XXIV (1949). [3] NICCOLAO MANUCCI, STORIA DO MOGIOR, TRANS. W. IRVINE (CALCUTTA 1966), ii. 41. ص ۱۹۹-۲۱۲

امام بخاری و ترمذی کے ایک شیخ

علامہ ابنِ سلام ہروی

از جناب نور احمد شاہتاز، کراچی۔

تاریخ کے صفحات دوسری صدی کے نصف آخر اور تیسری صدی کے ربع اول میں ایک ایسی نابغہ روزگار ہستی کا پتہ دیتے ہیں جو اپنے عہد کے عبداللہ بن عباس سمجھے جاتے تھے۔ تاریخ بغداد (۱۲/۴۱۱) میں عبداللہ بن طاہر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ علمائے اسلام چار ہی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس اپنے دور کے، امام الشعبی اپنے دور کے، قاسم بن معین اپنے دور کے، اور ابو عبید القاسم بن سلام اپنے عہد کے عبقری تھے۔

وطن اور نام | ابو عبید القاسم بن سلام بغدادی، دراصل خراسان کے شہر ہرات سے تعلق رکھتے تھے[۱] اسی لیے بعض مورخین نے ان کے نام کے ساتھ خراسانی اور ہروی لکھا ہے[۲]۔ بنی ازد کے غلام تھے بعض نے انصار کا غلام لکھا ہے۔

ان کے والد کا نام سلام ہے (لام کی تشدید کے ساتھ) ابو الفضل بن العمید (م ۳۶۰ھ) کے ہاں کسی نے ابن سلام (لام کی تخفیف سے) کہا تو علمائے بغداد نے اسے برا جانا۔

سلام۔ ہرات کے کسی شخص کے ہاں غلام تھے رومی الاصل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سلام اور ان کے صاحبزادے ابو عبید اپنے مالک کے بیٹے کے ساتھ مدرسہ گئے اور وہاں استاد سے جا کر کہا "علی القاسم فانھا کیسۃ" قاسم کو پڑھایئے یہ بڑے

ذہین ہیں"۔ چنانچہ ان کے ان عربی الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچھی عربی نہیں جانتے تھے جب ہی انہوں نے مذکر مونث تک کا لحاظ نہیں کیا۔

علامہ ابو عبید خراسان کے شہر ہرات میں ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے[۳]۔ زبیدی نے انکا سن ولادت ۱۵۴ھ بتایا ہے[۴]۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے اپنے والد گرامی کی خواہش پر بچپن ہی میں ہرات کو خیرباد کہا اور بصرہ و کوفہ کا رخ کیا جو اس دور کے علمی مراکز تھے۔ وہاں لغت (عربی)، فقہ، حدیث، علم کلام اور دیگر علوم کی تحصیل کی[۵]۔ طلب حدیث کے لیے دمشق بھی گئے اور وہاں شیوخ حدیث سے استفادہ کیا[۶]۔

اتالیقی اور منصب قضا | تکمیل علم کے بعد ابو عبید اتالیق مقرر ہوئے چنانچہ بغداد میں شارع بشر و بشیر پر ایک لڑکے کو پڑھایا کرتے تھے۔ پھر خراسان آئے تو ہرثمہ بن اعین کے بچوں کی اتالیق مقرر ہوئے جو الرشید اور المامون کے دور کا معروف فوجی کمانڈر تھا۔ جسے مامون نے ۲۰۰ھ میں قتل کروایا[۷]۔ ثابت بن نصر بن مالک الخزاعی شام کے ایک مشہور قائد نے جو شام کے سرحدی علاقے کے والی بھی رہے۔ علامہ ابو عبید کی خدمات اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے لیے حاصل کیں۔ ثغورِ شام کی ولایت ملنے پر ثابت بن نصر نے علامہ ابو عبید کو طرسوس کا قاضی مقرر کیا[۸]۔ چنانچہ ۱۸ برس تک اس علاقے کے قاضی رہے پھر ۲۱۰ھ میں دوبارہ بغداد تشریف لے گئے[۹] اور وہاں عبداللہ بن طاہر والیِ خراسان سے ملاقات کی۔ اس نے ان کی عزت افزائی کی اور دو ہزار درہم ماہانہ وظیفہ مقرر کیا۔ ابو العباس احمد بن یحییٰ ثعلب کہتے ہیں:

طاہر بن عبداللہ سے تقرب | "طاہر بن عبداللہ بن طاہر اپنے والد کی زندگی ہی میں خراسان سے حج کو گیا تو اسحاق بن ابراہیم کے ہاں ٹھہرا۔ پھر اس نے اسحاق کو علما کی خدمت میں

روانہ کیا تاکہ وہ انہیں طاہر سے ملانے کے لیے لائے۔ چنانچہ بعض علمائے حدیث و فقہائے کرام ملنے آئے ان میں ابن الاعرابی اور ابونصر (صاحب الاصمعی) بھی تھے۔"

علامہ ابوعبید القاسم بن سلام کو بھی حاضریٔ دربار کا پیغام ملا مگر انہوں نے کہلا بھیجا کہ "علم کی طرف جایا جاتا ہے۔ علم کو بلایا نہیں جاتا۔" اسحاق کو ان کی یہ بات اور پیغام نہایت ناگوار گزرا، چنانچہ اس نے عبداللہ بن طاہر کی طرف سے انہیں ملنے والا (دوہزار درہم ماہانہ) وظیفہ بند کردیا اور عبداللہ بن طاہر کو واقعہ کی اطلاع بھی کردی، اس پر عبداللہ نے اسے لکھا علامہ ابوعبید نے سچ فرمایا اور میں انکی اس حق گوئی پر ان کا وظیفہ دوگنا کرتا ہوں، "تم ان کا سابقہ (روکا ہوا) بھی ادا کرو اور آئندہ بھی (نئی شرح کے مطابق) پابندی سے ادا کرتے رہو۔"[9] چنانچہ اس واقعہ کا دونوں حضرات کے تعلقات پر گہرا اثر ہوا اور ایک دوسرے کی قدر افزائی پہلے سے زیادہ ہوگئی۔ اب تو کیفیت یہ ہوئی کہ علامہ ابوعبید جب بھی کوئی کتاب لکھتے عبداللہ بن طاہر کو تحفۃً اس کا نسخہ بھجوا دیتے اور عبداللہ جواباً مال خطیر نذر کرتا[10] کہا جاتا ہے کہ علامہ ابوعبید نے جب اپنی کتاب "غریب الحدیث" مکمل کی اور عبداللہ بن طاہر کو بھجوائی تو اس نے بڑی تعریف کی اور کہا "ایسے شخص کو اپنی عقل و فہم کے مزید جوہر دکھانے کا موقع ملنا چاہیے اور اسے فکر معاش سے آزاد کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ اسی کے ساتھ ان کا ماہانہ وظیفہ دس ہزار درہم مقرر ہوا۔"[11]

ابودلف العجلی (۲۲۵ھ) کو علامہ ابوعبید کے علمی مرتبہ و مقام کا علم ہوا تو اس نے عبداللہ بن طاہر سے درخواست کی کہ دو ماہ کے لیے انہیں اس کے ہاں بھیجا جائے چنانچہ علامہ تشریف لے گئے اور دو ماہ ابودلف کو میزبانی کا شرف بخشا، واپسی

کے لیے روانہ ہونے لگے تو ابودلف نے تیس ہزار درہم کا نذرانہ پیش کیا جسے انہوں نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کردیا کہ "میں ایک ایسے شخص سے متعلق ہوں جو میری تمام ضروریات کا خیال رکھتا ہے پھر کسی اور سے کچھ لینا میرے لیے کیونکر جائز ہوسکتا ہے۔" جب ابن طاہر کے پاس پہنچے تو اسے اس واقعہ کا علم ہوچکا تھا۔ اس نے بھی تیس ہزار درہم پیش کیے جنھیں اس کے اصرار پر اس صورت میں قبول کیا کہ وہ رقم کی بجائے کچھ ساز و سامان (تحفے تحائف) خرید کر دیدے تاکہ اپنے وطن جاسکیں۔ عبداللہ نے ایسا ہی کیا۔

مرو میں قیام علامہ ابوعبید نے کچھ عرصہ "مرو" میں بھی گزارا، کہا جاتا ہے کہ طاہر ابن الحسین الخزاعی مشہور کمانڈر (۲۰۷ھ) جب خراسان گیا تو اس نے "مرو" میں قیام کیا اور مصاحبوں سے کہا کہ کسی ایسے عالم کو بلائیں جو رات بھر اس کے پاس قیام کرے اور جس سے اس کی مجلس میں کچھ علمی گفتگو ہوتی رہے۔ اسے بتایا گیا کہ یہاں کوئی ایسا بڑا عالم نہیں سوائے ایک شخص کے اور وہ ہیں علامہ ابوعبید۔ چنانچہ علامہ کو پیغام ملا اور وہ تشریف فرما ہوئے، گفتگو کرنے پر پتہ چلا کہ علامہ عربوں کی تاریخ کے بہت بڑے ماہر ہیں اور نحو و لغت و فقہ کے امام ہیں۔ طاہر نے کہا: آپ کو اس چھوٹے سے شہر میں رکھنا آپ کی قدر اور شخصیت کے ساتھ زیادتی ہے۔ اس نے ایک ہزار دینار نذر کیے اور کہا ابھی تو میں خراسان کی جنگ میں جارہا ہوں اور مجھے اچھا نہیں لگتا کہ آپ کو بھی اس سفر مشقت میں ڈالوں۔ آپ یہ ہدیہ قبول فرمایئے، واپسی پر اللہ نے چاہا تو ملاقات ہوگی۔ علامہ ابوعبید ان دنوں "غریب المصنف" لکھنے میں مصروف تھے طاہر کی واپسی تک اسے مکمل کرلیا۔ چنانچہ طاہر واپسی پر ان کو اپنے ساتھ سامرہ لے گیا۔[12]

مصر کا سفر ابوعبید ۲۱۳ھ میں مشہور محدث یحیی بن معین کے ساتھ مصر تشریف لے گئے،

جہاں تصنیف و تالیف کا کام آگے بڑھایا اور اپنی تصنیفات میں مصر کا تذکرہ بھی کیا مصر کے اس علمی سفر کا حال اپنی کتاب "غریب الحدیث" میں بھی کیا ہے۔

حدیث عقبہ بن عامر کی تشریح میں وہ لکھتے ہیں کہ "وہ صبیب (سرخ یا زرد رنگ) کا خضاب استعمال کرتے تھے اور صبیب تلوں کے پتوں کا پانی یا نباتات میں سے کوئی نبات ہے اور مصر میں مجھے بتایا گیا کہ ان کا پانی سرخ ہوتا ہے جس کے اوپر سیاہی ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قِسّی پہننے سے منع فرمایا ہے" پھر کہتے ہیں "قسی ایک لباس ہے جو ریشم سے تیار ہوتا ہے اور مصر سے لایا جاتا ہے"۔ اصحاب حدیث قِسّی کو قاف کے زیر اور سین کی تشدید سے پڑھتے ہیں، جبکہ مصری لوگ اسے قَسّی (قاف کے زبر اور سین کی تشدید سے) پڑھتے ہیں اور اس کا تعلق ایک شہر سے بتاتے ہیں جس کا نام "القس" ہے، علامہ کہتے ہیں میں نے وہ شہر دیکھا ہے[۱۳]

خواب میں نبی کی زیارت | ۲۱۹ھ میں علامہ ابو عبید حج کے لیے عازم مکہ ہوئے۔ فریضۂ حج ادا کیا۔ واپسی کے لیے سواری کرایہ پر حاصل کی تاکہ عراق جا سکیں۔ صبح سویرے روانگی کا پروگرام تھا۔ رات کو خواب دیکھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اس طرح کہ آپؐ تشریف فرما ہیں آپؐ کے آس پاس آپؐ کے پسندیدہ لوگ بیٹھے ہیں اور کچھ لوگ آجا رہے ہیں، جو سلام پیش کرتے ہیں اور مصافحہ سے مشرف ہو رہے ہیں، علامہ فرماتے ہیں مگر میں جیسے ہی قریب ہونے کی کوشش کرتا ہوں روک دیا جاتا ہوں۔ پھر میں لوگوں سے پوچھتا ہوں تم مجھے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملنے کیوں نہیں دیتے۔ جواب ملتا ہے تم نہیں مل سکتے کیونکہ تم کل عراق جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ میں نے ان لوگوں سے کہا اگر یہ وجہ ہے تو میں عراق جانے کا ارادہ ملتوی کر دیتا ہوں۔ لوگ مجھ سے وعدہ لیتے ہیں اور پھر مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف ملاقات کی اجازت مل جاتی ہے، چنانچہ میں حاضر خدمت ہو کر سلام عرض کرتا ہوں، حضورؐ مجھ سے مصافحہ کرتے ہیں۔ صبح ہوتی ہے اور میں کرایہ کی سواری واپس کر کے عراق واپسی کا ارادہ ترک کر ڈالتا ہوں[۱۴]

اسی روز سے علامہ ابو عبید مکہ میں سکونت پذیر ہوئے تا آنکہ وہیں ان کا انتقال ہوا اور دُورِ جعفر میں محرم ۲۲۴ھ میں تدفین عمل میں آئی[۱۵]۔ بعض مورخین نے سن وفات ۲۲۲ھ اور بعض نے ۲۲۳ھ اور ۲۳۰ھ بھی بیان کیا ہے[۱۶]۔ انہوں نے ۷۳ برس عمر پائی، بعض کے بقول آپ کا انتقال ۶۷ برس کی عمر میں ہوا[۱۷] لیکن زیادہ صحیح روایت ۷۳ برس کی ہے۔

اساتذہ | علامہ ابو عبید نے علوم ادب، لغت، حدیث اور قرأت اپنے دور کے ممتاز عراقی و شامی علماء سے حاصل کیے۔ ان کے بعض مشائخ (اساتذہ) کے اسمائے گرامی (بترتیب حروف تہجی) حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ شیخ الاحمر علی بن المبارک (م ۱۹۴ھ) ۲۔ شیخ اسحاق بن یوسف الازرق (م ۱۹۵ھ) ۳۔ شیخ اسمٰعیل بن جعفر (م ۱۸۰ھ) ۴۔ شیخ اسمٰعیل بن علیہ الاسدی (م ۱۹۳ھ) ۵۔ شیخ اسمٰعیل بن عیاش (م ۱۸۱ھ) ۶۔ شیخ الاصمعی ابو سعید عبد الملک بن قریب (م ۲۱۶ھ) ۷۔ شیخ ابن الاعرابی ابو عبید اللہ محمد بن زیاد (م ۲۳۱ھ) ۸۔ شیخ الاموی یحییٰ بن سعید (م ۱۹۴ھ) ۹۔ شیخ ابوبکر بن عیاش (۱۹۳ھ) ۱۰۔ شیخ جرید بن عبد الحمید (م ۱۸۷ھ) ۱۱۔ شیخ حجاج بن محمد (م ۲۰۶ھ) ۱۲۔ شیخ حفص بن غیاث (م ۱۹۴ھ) ۱۳۔ شیخ حماد بن مسعدۃ (م ۲۰۱ھ) ۱۴۔ شیخ ابو زیاد الکلابی یزید بن عبد اللہ بن الحر (سن وفات معلوم نہیں ہو سکا) ۱۵۔ شیخ ابو زید الانصاری سعید بن اوس (م ۲۱۴ھ) ۱۶۔ شیخ سعید بن الحکم بن ابی مریم المصری

(م ۲۳۴ھ) ۱۷۔ علامہ سفیان بن عیینہ (م ۱۹۸ھ) ۱۸۔ شیخ سلیمان بن عبد الرحمن بن حماد (م ۲۵۲ھ) ۱۹۔ شیخ سلیم بن عیسیٰ (م ۱۸۸ھ) ۲۰۔ الامام الشافعی محمد بن ادریس (م ۲۰۴ھ) ۲۱۔ شیخ شجاع بن ابی نصر (م ۱۹۰ھ) ۲۲۔ شریک بن عبد اللہ القاضی (م ۱۷۷ھ) ۲۳۔ شیخ صفوان بن عیسیٰ القسام (م ۲۰۰ھ) ۲۴۔ عباد بن عباد المہلبی (م ۱۸۱ھ) ۲۵۔ عبد الاعلیٰ بن مسہر بن عبد الاعلیٰ الغسانی (م ۲۱۸ھ)[18]

کثرت مطالعہ و قوت حفظ | علامہ ابو عبید مہندی کا خضاب کرتے تھے، داڑھی اور سر کے بال سرخ تھے۔ ان کے چہرے سے ہیبت و وقار ظاہر ہوتا تھا۔ نہایت عبادت گزار اور کثیر المطالعہ تھے۔ انہوں نے اپنی رات کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ابو بکر بن الانباری کہتے ہیں کہ "ان کی راتیں عبادت اور مطالعہ میں گزرتیں، تہائی رات یا اس سے بھی کم آرام فرماتے"[19] حافظ قوی اور یادداشت بڑی عمدہ تھی۔ ان کے ایک شاگرد ابو منصور نصر ابن داؤد صاغانی کہتے ہیں "ابو عبید فرمایا کرتے تھے کہ ایک نشست میں پچاس حدیثیں یاد کر لینا میرے لیے چنداں مشکل نہ تھا"[20] ابو عبید اپنے اساتذہ و شیوخ حدیث کا بے حد احترام کرتے اس کی ایک مثال خود ان کا یہ قول ہے کہ میں نے کبھی کسی استاد یا شیخ حدیث سے ملاقات کرنا چاہی تو ان کے دروازے پر جا کر ان کے از خود باہر آنے کا منتظر رہا اور دروازہ کھٹکھٹانا یا دستک دینا سوئے ادب سمجھا۔ اس سلسلہ میں میں نے ہمیشہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس ارشاد کو پیش نظر رکھا "وَلَوْ اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ" (اے نبی ان کے لیے بہتر ہوتا اگر وہ آپ کے باہر تشریف لانے تک صبر سے انتظار کرتے)[21]

ان کی علمی دیانتداری کا اندازہ اس قول سے کیا جا سکتا ہے جو ان کے ایک

شاگرد عباس بن محمد الدوری سے منقول ہے کہ "میں نے علامہ ابو عبید کو فرماتے سنا کہ شکر علم کا تقاضا یہ ہے کہ جب کوئی بات کسی کو نہ معلوم ہو لیکن پھر اسے اس کا علم ہو جائے اور وہ اس بات کو لوگوں سے بیان کرے تو اس اعتراف کے ساتھ بیان کرے کہ مجھے بھی اس کا علم نہیں تھا تا آنکہ فلاں صاحب نے مجھے اس طرح یہ بات سکھائی یا سمجھائی اور یوں میرے علم میں یہ بات آئی"[22] وہ فرماتے تھے "متبع سنت شخص ایسا ہے جیسے آگ پر قابو پانے والا اور میرے نزدیک اتباع سنت فی زمانہ اللہ کی راہ میں (جہاد) تلوار چلانے سے بھی زیادہ افضل ہے"۔

علامہ ابو عبید نے اپنی زندگی میں اور بعد از وصال زبردست شہرت پائی انکے اور بعد کے دور میں ہمیشہ انہیں اچھے الفاظ سے یاد کیا گیا۔ ان کی شہرت ایک متقی، زاہد، عابد شب زندہ دار، کریم النفس، مجسمہ اخلاق، کریمانہ، فاضل علوم و فنون، تصنیف و تالیف کے دھنی اور اجتہاد و تبحر علمی کے مالک شخص کی شہرت تھی۔

معاصرین کا کمال اعتراف | حضرت امام احمد بن حنبل فرماتے تھے۔ علامہ ابو عبید استاذ ہیں اور ان کے علم و فضل کی وجہ سے روز بروز ان کی قدر و منزلت ہم پر واضح ہو رہی ہے"[23] سنن ابی داؤد کے جامع علامہ ابو داؤد سلیمان بن اشعث سے علامہ ابو عبید کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا "وہ ایک امین و ثقہ عالم ہیں"۔ معروف محدث و اسماء الرجال کے عالم یحییٰ بن معین سے کسی نے پوچھا کہ "ابو عبید سے روایت حدیث لینا کیسا ہے؟ آپ نے جواب دیا مجھ سے ابو عبید کے بارے میں پوچھتے ہو؟ وہ تو ایسی شخصیت ہیں کہ ان سے لوگوں کے بارے میں پوچھا جائے" پھر کہا میں اصمعی کے پاس تھا کہ ابو عبید تشریف لائے علامہ اصمعی نے انہیں آتا دیکھ کر کہا جانتے ہو آنے والا کون ہے؟ موجودین نے کہا ہاں،

اصمعی نے کہا جب تک یہ شخص زندہ ہے لوگوں کو کوئی نقصان نہ پہونچے گا۔[۲۴] ابراہیم الحربی ان کے بارے میں کہتے ہیں" ابو عبید تو ایسے تھے جیسے پہاڑ میں روح پھونک دی گئی ہو اور اس کی ہر شے بھلی لگ رہی ہو"[۲۵] قاضی احمد بن کامل کہتے ہیں" علامہ ابو عبید القاسم بن سلام اپنے مذہب و علم میں انتہائی فاضل تھے، ربانی قسم کے عالم تھے، علوم و فنون اسلامی کے ماہر، قرآن و سنت اور فقہ کے متبحر عالم، ثقہ راوی جن کی ثقاہت میں طعن نہیں کیا گیا"[۲۶]

الجاحظ نے کتاب المعلمین میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے" وہ معلمین میں سے اور پھر فقہائے محدثین میں سے تھے۔ ان کا شمار ماہرین علم نحو میں بھی تھا اور وہ ان علما میں شامل تھے جو کتاب و سنت، ناسخ و منسوخ، غریب الحدیث اعراب القرآن کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ جن لوگوں نے علم کے متعدد اصناف میں کتابیں لکھی ہیں علامہ ابو عبید القاسم بن سلام ان لوگوں میں سر فہرست ہیں۔ وہ ادیب تھے، ان کی طرز پر علم و ادب کی مفید تالیفات کم ہی لوگوں نے لکھی ہوں گی"[۲۷]

ابن درستویہ ان کے بارے میں کہتے ہیں" وہ بغداد کے محدثین اور کوفیوں کے نظریات پر علم نحو کے زبردست عالم تھے، لغت کے راویوں میں تھے اور قرأت میں بصرہ کے علماء سے منفرد تھے۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہے جو فنون کثیرہ میں لکھنے والے اور شہرت پانے والے تھے۔ وہ صاحب فضل و مجد اور عابد و زاہد صاحب مذہب تھے"[۲۸] ابو العباس احمد بن یحیٰی ثعلب کا خیال ہے کہ اگر ابو عبید بنی اسرائیل میں ہوتے تو ان کی شان کچھ اور ہی ہوتی"[۲۹]

ہلال بن العلاء الرقی کہتے ہیں" اللہ نے اس امت پر چار اشخاص کا انعام فرمایا جو اپنے زمانہ کے عبقری تھے، ایک تو امام شافعی کہ جن کی فقہ حدیث قابل داد ہے۔ دوسرے امام احمد بن حنبل کہ جنھوں نے صبر و استقامت سے فتنوں کا مقابلہ کیا، اگر امام صاحب

نہ ہوتے تو لوگ کفر کا شکار ہو جاتے، تیسرے یحیٰی بن معین کہ جنھوں نے احادیث رسول کو کذب سے محفوظ کیا اور چوتھے ابو عبید القاسم بن سلام کہ جنھوں نے غریب الحدیث کو بیان کیا اگر وہ ایسا نہ کرتے تو لوگ گمراہ ہو جاتے"[۳۰]

علاوہ ازیں ابو قدامہ، ابن راہویہ، عبداللہ بن طاہر، ابن حبان، حاکم الازہری، الدانی، ابن الجزری، ذہبی، الداؤدی و دیگر مشاہیر علماء و مشائخ نے علامہ ابن سلام کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں شاندار الفاظ سے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

تصنیفات | ابو عبید نے تالیفات کا نادر ورثہ میں چھوڑا، ان میں سے بیشتر علوم قرآن کریم، علوم حدیث شریف، لغت، امثال، انساب اور تراجم پر مشتمل ہیں۔ ابن درستویہ کے مطابق ان کی پچیس سے زائد مصنفات علوم قرآن، فقہ، غریب الحدیث، امثال، معانی الشعر اور غریب المصنف کے موضوعات پر ہیں"[۳۱] علامہ ابن ندیم نے اور علامہ ابن خلکان نے ان کو صاحب تصانیف کثیرہ لکھا ہے[۳۲]

ابو طیب لغوی کا خیال ہے کہ چونکہ ان کی تالیفات کو سرکاری سطح پر سراہا جاتا تھا، اس لیے ان کی تالیفات کی تعداد بہت زیادہ ہے[۳۳]

ان کی بعض معروف کتابوں کے اسماء ابن ندیم نے الفہرست (ص ۱۱۲) میں ذکر کیے ہیں نیز انباہ الرواۃ (جلد ۳، ص ۲۲) میں، معجم الادباء (ج ۱۶، ص ۲۶۰) میں، وفیات الاعیان (ج ۴، ص ۶۳) میں، عیون التواریخ (ص ۲۸۸) میں، مرآۃ الجنان (ج ۲، ص ۸۰) میں اور کشف الظنون (جلد ۲، ص ۱۳۸۵) میں ابو عبید کی تالیفات کا ذکر ملتا ہے۔ ہم اختصار کے پیش نظر صرف چند مصنفات کا ذکر کرتے ہیں۔

الاحداث، آداب الاسلام، ادب القاضی، استدراک الغلط، الامثال السائرۃ، الاموال،

انساب الخلیل، الایمان والنذور، الحجر والتفلیس، الحیض، الخطب والمواعظ، الشعراء، شواہد القرآن الطلاق، الطہارۃ، عدد آی القرآن، غریب الحدیث، غریب القرآن، الغریب المصنف، فضائل الفرس، فضائل القرآن، القرآت، القضاء وآداب الحکام، کتاب الایمان ومعالمہ وسننہ واستکمالہ ودرجاتہ، کتاب النحو، المجاز فی القرآن، المذکر والمونث، معانی الشعر، معانی القرآن، فضائل الفرسان، المقصور والممدود، الناسخ والمنسوخ، النسب، نصوص فی الحج، النکاح[۳۴]۔

علامہ کے تلامذہ علامہ کے تلامذہ کی تعداد کا تعین مشکل امر ہے۔ ان کے بعض تلامذہ نے علم و فن کے میدان میں بڑی شہرت پائی۔ اسماء الرجال کی کتب میں ان کے تلامذہ کے احوال بڑی شرح و بسط سے مذکور ہیں۔ علامہ کے علمی مرتبہ و مقام اور ان کی شہرت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کے تلامذہ میں صحاح ستہ کے بعض مولفین، تاریخ و رجال کے ماہرین، لغت و ادب کے ائمہ اور فقہ و فتاوی کے مصنفین کے نام آتے ہیں۔

ان کے مشہور تلامذہ میں امام احمد بن حنبل، امام بخاری، یحییٰ بن معین، امام ترمذی، امام ابو داؤد سجستانی، علامہ البلاذری، علامہ الثعلبی، علامہ الدارمی، ابن ابی الدنیا، امام علی بن عبدالعزیز البغوی، شیخ ابوالحسن الطوسی جیسے اکابر علماء موجود ہیں[۳۵]۔

مصادر و مراجع

۱؎ ابن ندیم الفہرست۔ ص ۱۱۲، مطبوعہ مصر القاہرہ ۱۳۴۸ھ۔ نیز الخطیب البغدادی، تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰۳، مطبوعہ مصر ۱۹۳۱ء۔ ۲؎ ابن سعد۔ طبقات ابن سعد، ج ۷، ص ۳۵۵، مطبوعہ سخاؤ لیڈن ۱۹۰۹م ۳؎ الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۵۷م۔ نیز تاریخ بغداد۔ ج ۱۲ ص ۴۱۵، طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۳۵۵ ۴؎ ابن عساکر، تاریخ مدینہ دمشق، حرف قاف، دار الکتب المصریہ۔

۵؎ ابن خلکان، وفیات الاعیان، ج ۴، ص ۶۲، مطبوعہ مصر ۱۲۹۹ھ، روڈلف زلہائم، الامثال العربیہ القدیمہ، ص ۸، مطبوعہ بیروت ۱۹۷۱م ۶؎ ابن عساکر، تاریخ مدینہ دمشق (حرف قاف) نیز الداؤدی، طبقات المفسرین مطبوعہ القاہرہ ۱۹۷۲ء ۷؎ ابن الاثیر، الکامل و تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰۴۔ نیز القفطی، انباہ الرواۃ علی انباہ النحاۃ، مطبوعہ مصر ۱۹۷۳ء ۸؎ ابن خلکان، وفیات الاعیان، ج ۴ ص ۶۱ نیز یاقوت الحموی، معجم الادباء، ج ۱۶ ص ۲۵۴۔ مطبوعہ احمد فرید، مصر ۱۹۳۶ء۔ نیز ابن عماد الحنبلی، شذرات الذہب، ج ۲ ص ۵۵، مطبوعہ مصر ۱۳۵۰ھ۔ نیز نووی، تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۵۷، مطبوعہ القاہرہ۔ و ابن ندیم، الفہرست، ص ۱۱۲ ۹؎ ابن عساکر، تاریخ دمشق (حرف قاف) نیز انباہ الرواۃ، ج ۳ ص ۱۷، معجم الادباء، ج ۱۶ ص ۲۶۰ ۱۰؎ القفطی انباہ الرواۃ، ج ۳ ص ۱۳، ابن عساکر، تاریخ دمشق (حرف قاف) ابن الانباری، نزہۃ الالباء، ص ۱۳۸، مطبوعہ القاہرہ مصر ۱۹۶۸ء۔ الیاقوت، معجم الادباء، ج ۱۶ ص ۲۵۵۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۱۰، ص ۲۹۱، مطبعۃ السعادۃ، القاہرہ ۱۱؎ نزہۃ الالباء، ص ۱۳۸، معجم الادباء، ج ۱۶ ص ۲۵۵، البدایہ والنہایہ، ج ۱۰، ص ۲۹۱، تاریخ دمشق (حرف قاف)، انباہ الرواۃ، ج ۳ ص ۱۵ ۱۲؎ الصحاح (قس) ج ۲، ص ۹۶۰۔ ابوعبید القاسم بن سلام، غریب الحدیث، ج ۱ ص ۲۳۶، مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۶۷ء ۱۳؎ ابوبکر زبیدی، طبقات النحویین واللغویین، ص ۲۲۹، القاہرہ ۱۹۴۸ء، ابن عماد الحنبلی شذرات الذہب، ج ۲ ص ۵۵، القاہرہ ۱۳۵۰ھ محمد بن شاکر الکتبی، عیون التواریخ، ص ۲۸۸۔ دار الکتب المصریہ ۱۴؎ ابن قاضی شہبہ ج ۲ ص ۴۲۲۔ دار الکتب المصریہ ۱۵؎ البخاری، التاریخ الکبیر ج ۴ (۱) ص ۱۷۲، مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۶۰ھ۔ الزبیدی، طبقات النحویین واللغویین ص ۲۱۹، القاہرہ ۱۹۵۴ء۔ ابن حجر، تہذیب التہذیب، ج ۸، ص ۳۱۵، حیدرآباد دکن ۱۳۲۶ھ ۱۶؎ خطیب، تاریخ بغداد، ج ۱۲، ص ۴۱۵۔ نزہۃ الالباء ص ۱۴۱۔ انباہ الرواۃ ج ۳ ص ۲۰۔

ابن مکتوم، تلخیص اخبار النحویین، ص ۱۹۲۔ دار الکتب المصریہ [14] السیوطی، بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ، ج ۲ ص ۲۵۴، القاہرہ ۱۹۶۴ء۔ نیز ابن الجزری، طبقات ابن الجزری، ج ۲ ص ۱۸، القاہرہ ۱۹۳۵ء۔ نیز ابو الفداء، تاریخ ابو الفداء، ج ۲ ص ۳۶، مکتبہ النہضہ مصر۔ نیز ابن حجر عسقلانی، تہذیب التہذیب، ج ۸ ص ۳۱۵، مطبوعہ حیدر آباد دکن [15] خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ج ۱۲ ص ۴۰۴، نیز السبکی، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۷۰، مطبوعہ القاہرہ ۱۳۲۴ھ۔ نیز ابن خلکان۔ وفیات الاعیان۔ ج ۴ ص ۶۱ [16] السبکی، طبقات الشافعیہ۔ ج ۱ ص ۲۷۱، نیز محمد بن شاکر الکتبی، عیون التواریخ، ص ۲۸۹، دار الکتب المصریہ خطیب، تاریخ بغداد، ج ۱۲ ص ۴۰۸ [17] الزبیدی، طبقات النحویین واللغویین۔ ص ۲۱۸۔ القاہرہ ۱۹۹۴ء [18] الداودی۔ طبقات المفسرین ج ۲ ص ۳۶۔ القاہرہ ۱۹۷۲ء [19] المزی ج ۴، ص ۳۴۹۔ الداودی ج ۲ ص ۳۹، تاریخ دمشق (حرف قاف) [20] المزی، تہذیب الکمال ۵۵۵۔ عیون التواریخ ۲۸۸۔ تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰۴ [21] تلخیص ابن مکتوم۔ ص ۱۹۲، نزہۃ الالباء ص ۱۴۱۔ انباہ الرواۃ ج ۳ ص ۲۱ [25] وفیات الاعیان ج ۴ ص ۶۱۔ تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۱۶۔ البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۹۲ [26] بغیۃ الوعاۃ ج ۲ ص ۲۵۳۔ روضات الجنات ۴۵ مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۸۴ [27] معجم الادباء ج ۶ ص ۲۵۵۔ طبقات النحویین واللغویین ص ۲۱۷ [28] الذہبی طبقات المفسرین ج ۲ ص ۴۳ تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰۴ [29] تاریخ دمشق (حرف قاف)۔ تلخیص ابن مکتوم ۱۹۲ [30] وفیات الاعیان ج ۴ ص ۶۱۔ نزہۃ الالباء، ص ۱۴۰۔ تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۱۱ [31] نزہۃ الالباء ص ۱۳۷۔ وفیات الاعیان ج ۴ ص ۶۱ معجم الادباء ج ۱۶ ص ۲۶۴ [32] ابن ندیم الفہرست ص ۱۱۳ [33] مراتب النحویین ص ۶۴۔ السبکی طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۶۰ [34] ابن ندیم الفہرست ص ۱۱۲۔۱۱۳۔ وفیات الاعیان ۴۔ ۶۳، ابن حجر المعجم المفہرس ص ۴۴۔ بروکلمان، تاریخ الادب العربی ج ۲ ص ۵۹ [35] میزان الاعتدال ج ۴ ص ۴۱۰ [36] الذہبی، العبر ج ۱ ص ۱۵۴ نیز ج ۲ ص ۴۵، ۵۵، ۶۵، ج ۲ ص ۱۲، ۴۴، ۵۴، ۶۲، ۶۵، بروکلمان، تاریخ الادب العربی ج ۳ ص ۳۲۔

مولانا آزاد بلگرامی کی فارسی خدمات

از ڈاکٹر سید حسن عباس

مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۱۶۔ ۱۲۰۰ھ ق) بارہویں صدی ہجری کے ان مقتدر علما و فضلا میں ایک ہیں جن کی علمی خدمات کا احاطہ ایک مختصر سے مضمون میں نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے عربی اور فارسی زبان و ادبیات میں جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اس کا اندازہ ان کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد سے ہی ہو جاتا ہے، عربی زبان و ادب میں کم و بیش چودہ پندرہ تالیفات ان کی یادگار ہیں۔ فارسی زبان و ادب میں ان کی تالیفات و تصنیفات کی تعداد بھی پندرہ سولہ ہے۔ اگر ان میں ان رسالوں اور مثنویوں کو بھی شامل کر لیا جائے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً مختلف مناسبتوں سے تالیف و تصنیف کی ہیں تو یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہو جائے گی۔ مولانا آزاد بلگرامی کی فارسی زبان و ادب میں خدمات کا اندازہ کرنے کے لیے اس مضمون میں ان کی تصنیفات کو موضوعی اعتبار سے تقسیم کیا جارہا ہے۔

شعرا کے تذکرے: ۱۔ ید بیضا ۲۔ سرو آزاد ۳۔ خزانۂ عامرہ۔

صوفیہ و مشائخ کے تذکرے: ۱۔ مآثر الکرام تاریخ بلگرام ۲۔ شجرۂ طیبہ ۳۔ روضۃ الاولیا۔

مناقب: ۱۔ سند سعادات فی حسن خاتمۃ السادات۔

ادبیات : ۱۔ دیوان ۲۔ بیاض ۳۔ شرح قطعۂ نعمت خاں عالی ۴۔ غزلان الہند ۵۔ مثنوی طلسم اعظم ۶۔ مثنوی در صفت مدینہ ۷۔ مثنوی سراپائے معشوق ۸۔ مثنوی معراج الکمال تکملۂ امواج الخیال ۹۔ قصیدہ در تعزیت میر عبد الجلیل و میر سید محمد شاعر بلگرامی ۱۰۔ مثنوی در جواب مثنوی میر عبد الجلیل بلگرامی ۱۱۔ مثنوی در تاریخ شہدائے جنگ ... ۱۲۔ سفر نامہ ۱۳۔ چند نظمیں و رسالے۔

تاریخ (ترتیب وتدوین) : ۱۔ مآثر الامرا۔

تصوف (ترتیب وتدوین) : ۱۔ انیس المحققین۔

پہلے ہم شعرا کے تذکروں کو موضوع بحث بناتے ہیں۔

۱۔ **ید بیضا** :۔ یہ فارسی کے قدیم و جدید شعرا کا ایک عام تذکرہ ہے۔

مولانا آزاد ۱۱۴۳ھ میں جب اپنے ماموں میر سید محمد شاعر بلگرامی (م ۱۱۸۵ھ) کی نیابت کے لیے سیوستان میں میر بخشی گری اور وقائع نگاری کا عہدہ سنبھالنے جا رہے تھے اس وقت اس تذکرے کی تالیف کے بارے میں غور کر رہے تھے۔ انہوں نے ۱۱۴۵ھ میں سیوستان ہی میں ید بیضا کی تالیف کا کام انجام دیا اور پورے ایک سال کے دوران اس کی تصنیف کی۔

تحریر اول میں ۵۳۲ شعرا کا تذکرہ شامل کتاب کیا گیا تھا جس کا آغاز فضل الدین محمد کاشانی سے اور اختتام میر محمد یوسف بن میر محمد اشرف کے تذکرے پہ ہوا تھا لیکن آزاد نے وطن واپس آنے کے بعد اس پر نظر ثانی کی اور ۱۱۴۸ھ میں اضافات کے ساتھ ید بیضا کا ایک اور نسخہ تیار کر کے پہلے والے نسخے کو منسوخ کر دیا اور ذیل کے مصرع سے تاریخ تکمیل حاصل کی۔

ع طبع کلیم ید بیضا نمود = ۱۱۴۸ھ

تحریر دوم میں مولف نے شعرا کی تعداد میں اضافہ کر کے ۱۳۵۹ کر دیا جس کا آغاز ابو الحسن شہید بلخی سے کیا۔ تحریر دوم میں الہ آباد کے شعرا کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ آزاد نے اس تذکرے میں اکثر شعرا کا ذکر نہایت مختصر الفاظ میں کیا ہے، البتہ انوری، خاقانی اور سنائی غزنوی جیسے معروف شعرا کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ایسے شعرا کی تعداد خاصی بڑی نظر آتی ہے جن کا شمار متاخرین میں ہوتا ہے اور ان میں سے اکثر غیر معروف بھی ہیں اس لحاظ سے اس تذکرے کی اہمیت کافی بڑھ جاتی ہے، افسوس ہے کہ اتنی اہم کتاب ابھی تک جدید تقاضوں کے ساتھ تصحیح ہو کر شایع نہیں ہو سکی ہے۔[1]

اس تذکرے کی تالیف کے دو سال بعد یعنی ۱۱۵۰ھ میں آزاد حج کی غرض سے حجاز چلے جاتے ہیں۔ جب وہاں سے واپس آتے ہیں تو بلگرام کے بجائے اورنگ آباد میں قیام کرتے ہیں۔ میر محمد یوسف بلگرامی انہیں مطلع کرتے ہیں کہ بنارس میں کسی نے ان کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ان کے تذکرے ید بیضا کو اپنے نام سے کر کے اس کے نسخے جا بجا بھیجے ہیں، آزاد یہ خبر سن کر برافروختہ ہوتے ہیں اور ایک غزل کہتے ہیں جس میں اسی موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ غزل یہ ہے :

بی شعوری از بنارس کرد فکر نارسی — خواست تا در دست گیرد شعلۂ جوالہ ای

برد تصنیف من و شہرت بنام خویش داد — از بہارم کرد غارت این ستمگر لالہ ای

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں۔ ڈاکٹر علی رضا نقوی: تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان، ص ۲۷۱ مطبوعہ تہران ۱۹۶۴ء۔ احمد گلچین معانی: تاریخ تذکرہ ہائے فارسی جلد دوم، ص ۴۱۹ مطبوعہ تہران ۱۳۵۰ شمسی۔

خواند واز بر کرد توریت و کلیم اللہ را — گفت من صاحب کتابم طوطی بنگالرای

سامری بالستی و دعوائے ید بیضا کنی — رو کہ در دست تو می زیبد دم گوسالرای

گرچہ خود را گوہر اصلی نماید در نظر — آب گردد عاقبت از آفتابم ژالرای[1]

اس تذکرے کے متعدد قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

- لکھنؤ، کتابخانۂ شاہان اودھ، شمارہ ۲۳، تاریخ کتابت ۱۱۵۰ھ، بگمان غالب بخط مصنف ہے۔[2]

- پٹنہ، کتابخانۂ خدا بخش، شمارہ ۶۹۱، ۲۶۰ص۔ از ص ۱۶۰ تا ۲۲۲ بخط آزاد اور بلاخمن کی یادداشت بھی موجود ہے۔[3]

- تیسرا اہم نسخہ وہ ہے جسے مقبول احمد صمدانی نے "نسخۂ صمدانی"[4] سے موسوم کیا ہے اور اس کی خصوصیات کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے:

یہ نسخہ مولف کے والد سید نوح کی فرمائش پر آزاد بلگرامی، غلام حسن اور غلام امام صادق (برادران آزاد) کے خط میں تھا اور رجعت الملت والامت سید برہان الدین انار اللہ برہانہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ ورق ۸۵ تک ایک خط شفیعا نستعلیق، ورق ۸۶ سے نستعلیق اور ورق ۱۴۴ سے خط بدل گیا ہے۔ کاتب اول نے بلگرامی کو "بالگرامی" لکھا ہے۔ پورے نسخے کی ضخامت پانچ سو صفحات سے زیادہ تھی لیکن اب

---

[1] دیوان فارسی آزاد (قلمی)، کتبخانۂ گنج بخش اسلام آباد (پاکستان)، شمارہ ۱۰۹۳۶، ورق ۳۱۰، و کلیات فارسی آزاد (قلمی) کتابخانۂ مجلس شورائے اسلامی (سنائے سابق) تہران (ایران) شمارہ ۶۷۵، ورق ۲۵۰۔ [2] فہرست اشپرنگر ۱/۱۴۲ [3] فہرست بانکی پور ۱۱۶/۸ [4] ماہنامہ معارف اعظم گڈھ دسمبر ۱۹۲۳ء۔

صرف ۴۲۲ صفحات ہی ہیں اور منشور صفاہانی کے ذکر تک۔ ناقص الآخر۔ نئی جلد بندی میں ملفوظات حضرت شیخ محمد یحییٰ معروف بہ شاہ خوب اللہ الٰہ آبادی کا اضافہ کر دیا گیا ہے جسے آزاد نے الٰہ آباد میں اپنی بیاض میں نقل کیا تھا۔

- علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، ذخیرۂ احسن مارہروی، شمارہ ۹۲۰/۷، نستعلیق معمولی، سید محمد علی بن سید امان اللہ حسینی واسطی بلگرامی، ۱۱۵۰ھ، یہ نسخہ مولف کے نسخے سے استنساخ کیا گیا ہے۔[1]

- پاکستان، اوچ، کتابخانۂ مخدوم سید شمس الدین گیلانی، شمارہ ۱۹۷، نستعلیق پختہ، شاہ محمد ولد گل محمد قریشی، ساکن بھوتہ واہن، پنجشنبہ ۱۸ ربیع الثانی ۱۲۰۸ھ، ۸۰۷ص[2]

- علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، ذخیرۂ منیر شمارہ ۲/۴ نستعلیق، عبد الوحید، ۱۲۲۵ھ، ۲۲۴ ورق[3]۔

- پاکستان، اوچ، کتابخانۂ مخدوم سید شمس الدین گیلانی، شمارہ ۱۹۶، نستعلیق خوب، بارہویں صدی ہجری، ۱۸۷ ورق[4]

- پاکستان، شکارپور، گڑھی یٰسین، مولانا محمد ابراہیم ناظم یٰسینی، نستعلیق خوب، ۲۷ جمادی الثانی ۱۲۶۷ھ دو صفحہ زرین، ۸۰۴ ص[5]

- حیدرآباد، کتابخانۂ آصفیہ، شمارہ ۱۸۶ و ۱۵۵، بہ نام "تذکرۂ صبح خنداں یعنی ید بیضا"[6]

- حیدرآباد، سالار جنگ میوزیم، شمارہ ۴۶ ۵، نستعلیق، ۱۳۲۳ھ، ۳۵۴ ورق[7]

---

[1] اطہر عباس رضوی: فہرست مخطوطات فارسی کتابخانۂ مولانا آزاد (انگریزی) ص ۱۷۵ [2] احمد منزوی: فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان ۱۱/۵۹۷ [3] اطہر عباس رضوی: فہرست مخطوطات فارسی کتبخانۂ مولانا آزاد، ۱۷۶ [4] احمد منزوی: فہرست مشترک ۱۱/۵۹۷ [5] ایضاً [6] ایضاً [7] فہرست سالار جنگ ۲/۱۵۵ و ۱۱۷ اس فہرست میں ید بیضا کے نسخہ شمارہ ۵۴۵ کے تحت شعرا کی فہرست دی گئی ہے۔

- حیدرآباد، سالار جنگ میوزیم، شمارہ ۵۴۵، نستعلیق، میر رضا حسین، اوائل چودھویں صدی، ۱۹۱۴ ص [1]
- علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، ذخیرۂ سبحان اللہ، شمارہ ۴۶/۹۲۰، نستعلیق، ۲۲۷ ورق [2]
- لکھنؤ، کتب خانۂ ندوۃ العلما، شمارہ ۷۹، نستعلیق، کرم خوردہ و ناقص الآخر، ۱۶۸ ص [3]
- لکھنؤ، لکھنؤ یونیورسٹی، کتب خانۂ ٹیگور، شمارہ ۵۱۷۹، ۴۳، بہ نام تذکرۃ الشعرای خلد [4]

۲۔ سروِ آزاد [5]: یہ دراصل مآثر الکرام کی دوسری جلد ہے جسے آزاد نے جداگانہ مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں ایسے فارسی شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے جو ۱۰۰۰ہجری سے سال تالیف ۱۱۶۶ھ تک ہندوستان میں پیدا ہوئے یا یہاں آکر سکونت اختیار کرلی۔ اس تذکرے میں ۱۴۳ فارسی گو اور آٹھ ہندی کے شعرا کا ذکر ہے۔ یہ دو فصلوں پر مشتمل ہے پہلی فصل میں فارسی گو شعرا اور دوسری فصل میں ہندی گو شعرا کا تذکرہ ہے۔ سروِ آزاد کے مقدمہ میں شعر و شاعری کی ابتدا سے بحث کی گئی ہے۔ فصل اول مولانا سحابی استرآبادی سے شروع ہو کر محمدون بلگرامی کے ترجمہ پر ختم ہوتی ہے جبکہ فصل دوم کا آغاز شیخ شاہ محمد بن شیخ معروف بہ فرلی سے ہوتا ہے اور اختتام محمد عارف بلگرامی پر۔ آزاد نے سروِ آزاد کی

---

[1] فہرست سالار جنگ ۲/۱۵۵ و ۱۱۱۷، اس فہرست میں ید بیضا کے نسخہ شمارہ ۵۴۵ کے تحت شعرا کی فہرست دی گئی ہے [2] اطہر عباس رضوی، ۱۰۶، [3] فہرست ندوہ ۲/۶۹۴ [4] معارف: ید بیضا کے دو قلمی نسخے کتب خانہ دار المصنفین میں بھی ہیں [5] معارف: اس کا بھی ایک خوبصورت قلمی نسخہ دار المصنفین کے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے جس کے سرورق پر ایک مہر ہے جس پر کتب خانہ نواب میر علی خاں کندہ ہے یہ ۱۲۹۲ھ کا مکتوبہ ہے۔ کاتب کا نام گنج منوہر ہے۔ صفحات ۴۰۴ ہیں [6] برای تفصیل رک بہ: تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان، ۳۸۳-۳۹۰۔ تاریخ تذکرہ ہای فارسی ۱/۲۰۶-۲۰۷۔

تالیف میں ۳۹ کتابوں کو بطور حوالہ یا ماخذ استعمال کیا ہے۔

آزاد نے اس تذکرے میں شعرا کا نام تخلص اور القاب وغیرہ کا ذکر کرنے کے ساتھ ان کی زندگی کے اہم اور خاص واقعات کی طرف بھی اشارے کیے ہیں اور ان کے اشعار کے بارے میں اپنی رائے درج کی ہے۔ اکثر شعرا کی تاریخ ولادت و وفات درج کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس طرح اس کتاب میں دس شعرا کی تاریخ ولادت اور ۹۳ شعرا کی تاریخ وفات ملتی ہے۔ آزاد نے ۶۳ شعرا کے دواوین سے براہ راست اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ اگر کسی شاعر کا دیوان بدخط تھا تو اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ اگر دواوین بخط شاعر تھے تو اس کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ انہوں نے سروِ آزاد میں جن شعرا کے دواوین سے جو بخط شاعر تھے، انتخاب کیا ہے ان میں میرزا محمد علی ولد ملا محمد سعید اشرف مازندرانی، میرزا مبارک اللہ مخاطب بہ ارادت خان و متخلص بہ واضح، مرشد قلی خاں مخمور، شیخ محمد علی حزین، دردمند فقیہ اور ضمیری بلگرامی کے دواوین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ثابت الہ آبادی کے ترجمہ میں انہوں نے صاف طور پر لکھ دیا کہ:

"نسخہ بدخطی بدست افتاد و بہ مشقت تمام این ابیات حاصل شد" [1]

میرزا مظہر جانجاناں، میر عبدالوہاب افتخار دولت آبادی اور سراج الدین علی خاں آرزو اکبرآبادی کے حالات اور انتخاب کلام براہ راست ان سے حاصل کرکے سروِ آزاد میں شامل کیے گئے ہیں اس طرح ان کے تراجم اور انتخاب اہمیت رکھتے ہیں۔

آزاد نے اس تذکرے میں قزلباش خاں امید ہمدانی، شیخ علی حزیں، میرزا عبدالرضا متین اصفہانی، میر عبدالولی عزلت، میر محمد ہاشم جرات، میرزا جان رسا، میرزا علی نقی ایجاد

---

[1] سروِ آزاد، ۲۰۳۔

سامانوی، میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی، سید جعفر روحی رنبیر پوری، شیخ محمد فاخر زائر، شیخ محمد ناصر افضلی، میر رضی اقدس شوستری اور شیخ اسد اللہ غالب سے اپنی ملاقات اور میرزا مظہر جانجاناں سے مراسلت کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح تقریباً بیس شعرا کی تاریخ وفات لکھی ہے۔

سرو آزاد کے مولف نے اس تذکرے میں بعض مواقع پر نقد و نظر سے کام لیا ہے اور بعض مسائل پر تنقیدی نظر ڈالی ہے، کبھی کسی شاعر کا دفاع کرنے کے دوران مسند قضاوت پر نظر آتے ہیں اور دوسروں کی آرا کا تحلیل و تجزیہ کرتے ہیں۔ یہ اظہار رائے خود نقد ادبی میں شمار ہوتی ہے جن سے ہمارے قدیم تذکرے خالی نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ خود آزاد نے اکثر شعرا کے کلام کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ بھی بڑی نپی تلی اور وزنی ہے۔ ان باتوں سے آگاہی کے لیے سرو آزاد کا مطالعہ از بس ضروری ہو جاتا ہے۔

تسامحات: اگرچہ تذکرہ سرو آزاد بے شمار خوبیوں کا حامل ہے اور مولف نے قارئین کو شعرا کے بارے میں معتبر و موثق معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اس کے باوجود چند فروگذاشتیں راہ پا گئی ہیں مثلاً:

۱۔ آزاد نے حکیم فغفور کی تاریخ وفات ۱۰۲۸ھ لکھی ہے[1] جبکہ صحیح ۱۰۲۹ھ ہے۔ اس بارے میں گلچین معانی لکھتے ہیں:

"جس سال میخانہ کی تالیف کا کام مکمل ہوا وہ ۱۰۲۸ھ ہے اور حکیم فغفور کی وفات ۱۰۲۹ھ میں ہوئی۔ لیکن اس بات کے پیش نظر کہ مذکورہ کتاب میں ۱۰۲۹ھ کی تاریخ

[1] سرو آزاد، ۳۸۔

بکثرت نظر آتی ہے، کہا جا سکتا ہے کہ مولف نے تاریخ وفات کا اضافہ تالیف کتاب کے بعد کیا ہے اور حکیم فغفور کے ترجمہ کی جگہ بھی بدلی گئی ہے۔ تقی الدین اوحدی نے بھی عرفات کو ۱۰۲۴ھ میں مکمل کرنے کے بعد تاریخ وفات ۱۰۴۴ تک بعد میں اضافہ کیا ہے چنانچہ حکیم فغفور کی تاریخ وفات ۱۰۲۹ھ درج کی ہے اور آزاد نے جو ۱۰۲۸ھ لکھی ہے وہ صحیح نہیں ہے"[1]

۲۔ آزاد نے ذکی ہمدانی کی تاریخ وفات ناظم تبریزی کے بقول ۱۰۲۵ھ لکھی ہے[2] جبکہ صحیح تاریخ ۱۰۲۴ھ ہے، اس سلسلے میں بھی گلچین معانی کا خیال ہے:

"(ذکی ہمدانی) کی تاریخ وفات کے بارے میں مجھے تقی الدین اوحدی کے قول پر اعتماد ہے کیونکہ اس نے ۱۰۲۴ھ میں عرفات مکمل کرنے کے بعد جب تک زندہ رہا شعرا کی تاریخ وفات درج کرتا رہا اور میں نے اس طرح کی تاریخیں ۱۰۴۲ تک اس تذکرے میں دیکھی ہیں"[3]

۳۔ آزاد نے زلالی خوانساری کے ترجمہ میں اس کی تاریخ وفات ۱۰۳۱ھ بتائی ہے اور لکھا ہے کہ مصرع: "از جہان رفت زلالی بجنان" سے تاریخ نکالی گئی ہے۔ لیکن استاد گلچین معانی نے صراحت کی ہے کہ "یہ مادہ تاریخ زلالی ہروی کا ہے جس نے ۹۳۱ھ میں وفات پائی اور یہی اعداد مذکورہ مصرع سے نکلتے ہیں"[4]

۴۔ آزاد بلگرامی نے نظیری نیشاپوری کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ "جب جہانگیر نے کتابہ [illegible] امر فرمود' مولانا غزلی گفتہ' بعرض رسانید کہ مصعش اینست:

[1] ملا عبد النبی فخر الزمانی قزوینی: میخانہ۔ ۴۵۹ [2] سرو آزاد، ۳۶ [3] میخانہ، ۵۸۲، [4] تاریخ تذکرہ ہای فارسی ۱/ ۷۰۷ و میخانہ ص ۵۸۲۔

این خاک درت صندل سرگشتہ سران را   بادہ مژہ جاروب رہت تاجوران را

اس سلسلے میں بھی گلچین معانی نے تذکرۂ میخانہ (ص ۷۹۵) پر صراحت کی ہے کہ "این غزل نیست قصیدہ است در تعریف دولت خانہ"۔

۵۔ آزاد نے سروآزاد میں منیر لاہوری کا نام ابوالبرکات لاہوری بن عبدالمجید ملتانی لکھا ہے جبکہ محمد صالح نے جو اس کے قریبی رشتہ داروں میں تھا اس کا نام عبدالجلیل بن حافظ ابواسحاق لاہوری لکھا ہے اور مولوی محمد شفیع کا خیال ہے کہ محمد صالح کا بیان زیادہ قابل اعتماد ہے [۱]

۶۔ ملا نوعی خبوشانی کے ترجمہ میں اس کی مثنوی "سوز و گداز" کی تالیف کا ذکر کرتے ہوئے آزاد نے لکھا ہے کہ یہ مثنوی شاہزادہ دانیال کے حکم پر اس نے کہی جبکہ اس کا حکم خود اکبر نے دیا تھا [۲]

۷۔ آزاد نے دانش مشہدی کے ذکر میں اس کے والد میر ابوتراب فطرت کی تاریخ وفات حیدرآباد میں ۱۰۶۰ھ بتائی ہے اور لکھا ہے کہ "اس کی قبر دائرہ میر محمد مومن استرآبادی میں دیکھی گئی۔ لوح مزار پر یہ رباعی ثبت ہے:

فطرت بہ تو روزگار نیرنگی کرد   نو اخت بہ مہر خارج آہنگی کرد
آن سینہ کہ عالمی درو می گنجید   اکنون زتردد نفس تنگی کرد

مذکورہ رباعی کا ذکر مآثر الامرا جلد دوم ص ۵۸۸ پر فیضی (م ۱۰۰۴) کے حال میں آیا ہے لیکن آزاد نے اس کی صراحت نہیں کی کہ یہ رباعی فیضی کی ہے یا فطرت کی۔

[۱] مقالات منتخبہ جلد اول، مقالہ مولوی محمد شفیع بعنوان منیر لاہوری [۲] مثنوی سوز و گداز تصحیح پروفیسر سید امیر حسن عابدی، مطبوعہ تہران۔

رباعی ذرا فرق کے ساتھ یوں ہے:

دیدی کہ فلک چہ زہرہ نیرنگی کرد   مرغ دلم از قفس شب آہنگی کرد
آن سینہ کہ عالمی درو می گنجید   تانیم دمی برآورم تنگی کرد

اس طرح کے سہو قلم کے باوجود تذکرۂ سروآزاد اپنی نوعیت کا بہت اہم تذکرہ ہے اور اس کے مولف نے حتی الامکان معتبر روایتیں نقل کی ہیں اس لیے چند استثنائی باتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم اس کے بیانات پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ ایرانی محققین منجملہ استاد گلچین معانی اور ڈاکٹر علی رضا نقوی نے بھی اس تذکرے کو بڑی اہمیت دی ہے ڈاکٹر علی رضا نقوی کا خیال ہے:

"تراجم اور انتخاب اشعار کی جامعیت کے پیش نظر اس تذکرے کو فارسی کے بہترین تذکروں کی صف میں رکھا جا سکتا ہے" [۱]

یہ تذکرہ ۱۹۱۳ء میں عبداللہ خاں کی تصحیح و تحشیہ اور مولوی عبدالحق کے زیر اہتمام لاہور سے شایع ہو چکا ہے۔

مولانا آزاد بلگرامی کے ایک معاصر اور بلگرام کے باشندے شیخ محمد صدیق سخنور بلگرامی [۲] (م ۱۲۲۲ھ) نے جن کا ترجمہ بھی سروآزاد میں شامل ہے، آزاد بلگرامی کے اس تذکرے کی رد میں ایک رسالہ "تحقیق السداد فی مزلۃ الآزاد" [۳] کے نام سے ۱۱۶۷ھ میں تالیف کیا جس کا مقصد آزاد کے کلام میں عیوب کی تلاش اور ان کو برملا کرنا تھا۔

[۱] تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ۳۸۸ [۲] برائے شرح احوال رجوع کریں: سروآزاد ۳۴۹، نتائج الافکار ۲۲۴، شمع انجمن ۲۰۸، عقد ثریا ۳۲، تاریخ خطۂ پاک بلگرام ۲۰۷، شرائف عثمانی (قلمی)

[۳] یہ رسالہ راقم السطور نے مجلہ قند پارسی شمارہ ۱۱ (دہلی) میں شایع کر دیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہوئی کہ سخنور بلگرامی کی خواہش کے مطابق آزاد نے سرو آزاد میں ان کے اشعار بڑی تعداد میں شامل نہیں کیے تھے۔ آزاد نے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ اگر وہ ان کے اشعار جوں کا توں شامل تذکرہ کر لیتے تو اہل نظر مصنف تذکرہ پر انگلیاں اٹھاتے پھر بھی آزاد نے چار اشعار شامل کر لیے اور سخنور کی خواہش کے مطابق ان کا ترجمہ بھی تبدیل کر دیا لیکن سخنور کو شاید یہ باتیں بری لگیں تب ہی انھوں نے سرو آزاد کی رد میں مذکورہ رسالہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ رسالہ سرو آزاد کی رد میں نہیں ہے بلکہ اس میں آزاد کے کچھ اشعار کے عیوب گنائے گئے ہیں اور اپنے خیال کے مطابق ان پر اصلاحیں کی گئی ہیں۔ اس رسالے کے ابواب یہ ہیں:

فصل اول: کلام آزاد کے عیوب کی تحقیق میں۔ سخنور نے اس فصل میں آزاد کے گیارہ اشعار پر "عیوب" کے عنوان سے اعتراضات کیے ہیں۔

فصل دوم: کلام آزاد میں تشنگی کا احساس۔ اس فصل میں سخنور نے آزاد کے آٹھ اشعار پر طبع آزمائی کی ہے۔

خاتمہ: کلام سخنور میں آزاد کے تصرفات۔

مولانا آزاد بلگرامی کے ایک اہم شاگرد میر عبدالقادر مہربان اورنگ آبادی نے سخنور کے رسالے کا جواب "تادیب الزندیق فی تکذیب الصدیق" کے نام سے لکھا۔[1]

۳۔ خزانۂ عامرہ: یہ شعرا کا تیسرا تذکرہ ہے جسے آزاد نے ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲-۶۳ء میں اورنگ آباد میں تالیف کیا تھا۔ اس تذکرے کی تالیف اپنے بھتیجے میر محمد اولاد ذکا بلگرامی کی خواہش پر کی۔ یہ ایسے شعرا کا مخصوص تذکرہ ہے

[1] اس رسالے پر راقم السطور کا مضمون ملاحظہ کریں۔ معارف اعظم گڑھ۔ جولائی ۱۹۹۵ء۔

جنھوں نے کسی کی مدح کی ہے اور صلہ و انعام بھی ممدوح سے حاصل کیا ہے۔ اس میں ۱۳۹ شعرا کا تذکرہ حروف تہجی کے اعتبار سے آیا ہے اس کی تالیف میں آزاد نے ستر کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور متن میں جابجا ان کا حوالہ بھی دیا ہے۔[1]

آزاد نے صوفیہ و مشائخ کے حسب ذیل تذکرے لکھے۔ ۱۔ مآثر الکرام تاریخ بلگرام ۲۔ شجرۂ طیبہ ۳۔ روضۃ الاولیا۔

۱۔ مآثر الکرام: یہ آزاد بلگرامی کی معروف ترین کتاب ہے جس میں ہندوستان خاص کر بلگرام کے علما و فضلا و مشائخ کا تذکرہ ہے۔ برصغیر میں یہ اپنے موضوع پر پہلی جامع کتاب ہے جو بعد کے تذکرہ نویسوں کے لیے ماخذ کا کام کرتی رہی ہے۔ آزاد بلگرامی پہلے شخص ہیں جنھوں نے علما و فضلا کے بارے میں برصغیر میں پہلی جامع کتاب تالیف کی اور پوری طرح تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ انھوں نے یہ کتاب ۱۱۵۰ھ میں بلگرام میں لکھنا شروع کی لیکن سفر حج پیش آجانے کے باعث اس کی تالیف کا کام معرض التوا میں پڑ گیا۔ مولف نے حج سے مشرف ہونے کے بعد اورنگ آباد میں سکونت اختیار کر لی اور ۱۱۶۶ھ میں اسے وہیں مکمل کیا۔ "خامۂ مسک" اس کی تاریخ ہے۔ آزاد نے اس کتاب کو دو فصلوں میں تالیف کیا ہے پہلی فصل میں ۸۰ فقرا کا ذکر ہے جبکہ دوسری فصل میں ۳۰ علما و فضلا کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں ۱۹۶ افراد کا تعلق بلگرام سے ہے اور ۵۰ کا ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہے۔ اس کی تالیف میں اکتالیس کتابوں کو بطور ماخذ استعمال کیا گیا ہے جن کے حوالے بھی متن کتاب میں جابجا دیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں بھی انھوں نے ۸۰ افراد کی تاریخ وفات لکھی ہے

[1] اس تذکرے پر ملاحظہ ہو راقم السطور کا طویل مقالہ۔ رضا لائبریری جرنل شمارہ ۲، ۱۹۹۵ء۔

اور اکثر کے سلسلے میں اپنے یا دوسروں کے کہے قطعات تاریخ وفات بھی درج کیے ہیں۔ بعض لوگوں کی تاریخ ولادت، مقام دفن، کرامات وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ مولف نے تاریخی واقعات پر بھی توجہ دی ہے۔ اس طرح ماثر الکرام ایک تاریخی ماخذ بھی ہے۔ انہوں نے اپنے بعض معاصرین کا تذکرہ بھی کیا ہے اور ان سے اپنی ملاقات کا ذکر بھی۔

یہ کتاب پہلی بار حیدرآباد سے ۱۹۱۰ء/۱۳۲۸ھ میں اور دوسری بار ۱۹۷۱ء میں لاہور سے طبع ہو چکی ہے۔

کتاب کی اہمیت کے پیش نظر مولانا شاہ محمد خالد میاں فاخری نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا جس کو ۱۹۸۳ء میں دائرۃ المصنفین کراچی نے شایع کیا۔ اس کتاب پر ایوب قادری مرحوم اور علامہ شمس ... بوی کے عالمانہ مقدمے بھی ہیں۔

شیخ غلام حسن صدیقی فرشوری متخلص بہ ثمین بلگرامی[1] کو ماثر الکرام پر یہ اعتراض ہوا کہ آزاد نے اپنے قبیلے کی تو بڑی ستایش کی ہے لیکن عثمانیوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ثمین نے ماثر الکرام کو اغلاط کا پلندہ کہا ہے، لہذا اس کی رد میں ۱۱۵۹ھ میں شرایف عثمانی[2] کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھ ڈالی۔ بلگرام کی تاریخ کے سلسلے میں شرایف عثمانی کا مطالعہ بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب ابھی شایع نہیں ہوئی ہے۔

۲۔ شجرۂ طیبہ : آزاد بلگرامی نے بلگرام کے سادات کے نسب و حالات اور فضائل میں یہ کتاب تالیف کی ہے۔ یہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہو کر

---

[1] برائے شرح احوال رک بہ: سرو آزاد، ۳۵۰، نتایج الافکار، ۱۳۱ [2] اس کتاب پر ملاحظہ ہو راقم السطور کا مقالہ۔ رضا لائبریری جرنل شمارہ ۳، ۱۹۹۶ء۔

اپنے عہد کے بلگرام کے سادات کے حالات و نسب کے بیان پر تمام ہوتی ہے۔ سبب تالیف میں مولانا آزاد بلگرامی نے اس کا ذکر بھی کیا ہے کہ میں نے خطۂ بلگرام کے سادات کرام کے نسب نامے لکھنے کا ارادہ کیا اور کتب معتبرہ نیز احادیث وغیرہ سے معلومات اخذ کیں۔ ماضی میں سید حسن دانشمند بن سید عبدالقادر نے بلگرام کے سادات واسطی کا نسب نامہ لکھا تھا اور ایک نسب نامہ میر عبدالجلیل بلگرامی نے بھی تالیف کیا تھا۔ میں نے احوال سلف ان رسالوں سے اخذ کیا اور احوال خلف جو قریب العہد تھے ان کی خود تحقیق کی اور یہ رسالہ تالیف کیا جسے شجرۂ طیبہ کے نام سے موسوم کیا۔

سادات بلگرام کا سلسلۂ نسب جو واسط (عراق) سے آئے تھے محمد بن عیسیٰ موتم الاشبال[1]

---

[1] موتم الاشبال یعنی شیر کے بچوں کو یتیم کرنے والا۔ یہ لقب عوام نے عیسیٰ کو دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ جنگ بصرہ سے واپس آرہے تھے تو کوفہ کا راستہ اختیار کیا۔ راستہ میں شیر درندہ کا سامنا ہوا شیر نے ان پر حملہ کر دیا اور عیسیٰ نے اس شیر کو مار ڈالا۔ یہ شیر ہمیشہ ہی مزاحم ہوا کرتا تھا۔ جب لوگوں کو خبر معلوم ہوئی تو انہوں نے شیر کو ختم کرنے والے کی تحسین و ستایش کی۔ ان کے غلام نے تعجب سے کہا: میرے آقا! شیر کے بچوں کو یتیم کر دیا؟ جواب ملا۔ ہاں! "انا موتم الاشبال"۔ اس کے بعد وہ اسی لقب سے یاد کیے جاتے رہے ملاحظہ کریں: زید بن علی ص ۳۷۰، سراج الانساب ص ۱۰۰۔ آزاد بلگرامی ایک قصیدے میں کہتے ہیں:

نازم بہ ایں شرف کہ ز آل پیمبرم — ثبت است مہر خاص نبوت بہ محضرم
آنم کہ نی بناخن شیر فلک کنم — فرزند ارشد اسد اللہ صفدرم
دانند صاحبان بصیرت بہای من — لعل ثمین زید شہید است گوہرم
تب از ہراس حربہ من شیر شرزہ را — یاد از صلاح موتم اشبال خنجرم
(کلیات آزاد ۱۸۵)

گرچہ باشد موتم الاشبال عیسی جد من — عیسی جان بخش شیرانم بامداد نفس
مرا بہ تیغ ستم کشت و گفت از سر ناز — چراغ دودۂ زید سپید روشن شد
(خزانۂ عامرہ)

سے ملتا ہے۔

کسی ماخذ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آزاد نے اس کتاب کو کب تالیف کیا تھا، البتہ متن کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ جب ان کے ماموں میر سید محمد شاعر سیوستان میں وقائع نویسی اور بخشی گری کے عہدے پر مامور تھے، آزاد اس وقت اس کی تالیف میں مشغول تھے شاعر بلگرامی ۱۱۵۵ھ تک وہاں برسر کار تھے اس کے بعد وہ بلگرام واپس آگئے۔ اس لیے اسے ۱۱۵۶ھ سے پہلے کی تالیف قرار دیا جانا چاہیے۔

آزاد نے اس کتاب کی تالیف میں چھبیس ماخذ کا استعمال کیا ہے جن کے حوالے متن میں ملتے ہیں۔ آزاد نے دیگر کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی شخصیات کی تاریخ ولادت، وفات وغیرہ کے درج کرنے میں بڑی احتیاط برتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے آٹھ افراد کی تاریخ ولادت اور ستائیس کی تاریخ وفات منجملہ اپنے کہے ہوئے دس قطعات تاریخ درج کیے ہیں اور بعض تاریخی نکات کی طرف اشارے کیے ہیں۔ سلطان شمس الدین التمش کے نام کا ایک تاریخی کتبہ بھی نقل کیا ہے۔ کتاب کا اسلوب نگارش صاف وسادہ و رواں ہے۔ فارسی جملوں اور عبارتوں کے ساتھ گاہ گاہ عربی الفاظ وعبارتیں بھی استعمال کی ہیں۔ خاص کر تاریخ وسال کا ذکر عربی عبارتوں میں کیا ہے۔ اکثر جگہوں پر فارسی اشعار بھی نثر کے درمیان لائے گئے ہیں اور بعض صاحبان تراجم کے اشعار بھی درج کیے ہیں۔

یہ کتاب ابھی قلمی نسخے کی صورت میں کتاب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہے۔ راقم السطور کے مطالعہ میں جو نسخہ آیا وہ کتابخانۂ آیت اللہ العظمی مرعشی نجفی قم (ایران) کا نسخہ ہے جو نستعلیق میں ہے اور اس پر کتاب خانۂ مہاراجہ سید محمد مہدی کی مہر ثبت ہے۔ یہ نسخہ سید علی رضا حسنی حسینی نے ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ میں آیت اللہ مرعشی نجفی کو دیا تھا۔ اس کے

دو اوراق پر آزاد کی دو بیضوی مہریں "فقیر آزاد" موجود ہیں۔ تعداد صفحات ۲۰۰ اور مخطوطہ کا نمبر ۲۸۴۳ ہے۔ تاریخ کتابت ۱۲۸۶ھ، پاکستان میں اس کے پانچ[1] نسخے ہیں جبکہ ہندوستان میں خدا بخش لائبریری پٹنہ میں تین، کتابخانہ آصفیہ حیدرآباد میں ایک اور علی گڑھ مولانا آزاد لائبریری ذخیرۂ احسن مارہروی میں "تتمہ شجرۂ طیبہ" از میر فدا حسین بلگرامی مکتوبہ ۱۳۱۲ھ کا ایک نسخہ موجود ہے۔ تہران یونیورسٹی سنٹرل لائبریری میں نسخہ قم کی مائکرو فلم موجود ہے۔ جس میں ایک تکملہ در شرح حال قبیلۂ سید نظام الدین مدھنا یک بھی شامل ہے۔

۳۔ روضۃ الاولیا: روضہ یا خلد آباد میں مدفون دس جلیل القدر صوفیہ کے شرح حال پر مشتمل کتاب روضۃ الاولیا کو آزاد نے ۱۱۶۱ھ میں مکمل کیا۔ مذکورہ افراد میں ایک خود مولف ہے۔ جن صوفیہ کا تذکرہ مذکورہ کتاب میں آیا ہے۔ ان کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱۔ شیخ برہان الدین محمد بن ناصر الملقب بہ غریب ہانسوی ۲۔ شیخ منتجب الدین زرزری زربخش ۳۔ نجم الدین امیر حسن بن علای سجزی دہلوی ۴۔ سید یوسف بن علی بن محمد الحسنی معروف بہ راجو قتال ۵۔ مولانا فرید الدین ۶۔ خواجہ حسین شیرازی ۷۔ شیخ زین الدین داؤد ۸۔ شاہ جلال ملقب بہ گنج رواں ۹۔ شاہ خاک رو ۱۰۔ مولف [آزاد بلگرامی]

آزاد نے اس کتاب کی تالیف میں سولہ ماخذ کا استعمال کیا ہے جن کے حوالے متن میں جابجا دیے ہیں۔ مقدمۂ کتاب میں دولت آباد کا تاریخی اور جغرافیائی

[1] فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان ۱۱/ ۹۶۶-۹۶۷۔

احوال بیان کیا ہے۔ یہ علاقہ صوفیہ کے مزارات کی وجہ سے خلد آباد کے نام سے بھی مشہور ہے۔ شیخ برہان الدین غریب ہانسوی کے ترجمہ میں مولف نے سلطان محمد تغلق کے ہاتھوں دہلی کی تباہی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب میں بھی مولف کا طرز نگارش صاف و سادہ ہے۔

یہ کتاب پہلی بار مطبع اعجاز صفدری اورنگ آباد سے ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں ۴۷ صفحات میں شایع ہوئی تھی۔ اسی سال بشیر الدین افسر اورنگ آبادی نے بھی مطبع خبیر اورنگ آباد سے اس کا ایک اور اڈیشن شایع کیا۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی استاد زبان و ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی نے بھی ۱۹۹۲ء میں مجلہ منادی دہلی جلد ۶۷ شمارہ ۴/۵ میں اسے مع ترجمہ اردو و حواشی شایع کیا ہے، پروفیسر فاروقی کا ترجمہ مع متن ۱۹۹۶ء میں ڈاکٹر محمد شعائر اللہ خاں وجیہی کے اہتمام سے ادارۂ نشر و اشاعت جامع العلوم فرقانیہ رام پور سے کتابی صورت میں منظر عام پر آیا۔

اس سے قبل اس کے تین اور ترجمے اردو میں ہو چکے تھے۔

۱۔ نفحات الاصفیا مترجم محمد عبد المجید، مطبع کریمی حیدر آباد دکن، ۱۳۴۵ھ۔[1]

۲۔ گلشن اصفیا مترجم منشی محمد فضل حسین، مطبع ہندوستان پرنٹنگ ورکس دہلی۔[2]

۳۔ از سیف اللہ قادری۔[3]

(باقی)

۱؎ و ۲؎ ترجمہ ہائے متون فارسی بزبانہائے پاکستانی، اختر راہی ص ۲۱۲ ۳؎ اسٹوری پرشین لٹریچر ۱/۱۰۲۵۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی مرحوم

از

جناب عبد اللطیف اعظمی صاحب

(۱)

"پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی پر میرا حقیر مضمون پہلے شایع ہو چکا ہے، جناب عبد اللطیف اعظمی نے جامعہ کے تعلق سے ان کے بارے میں جو معلومات بیان کیے ہیں ان کا میرے مضمون میں ذکر نہیں تھا۔" (ض)

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی مرحوم میرے مخلص اور بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے عالم کی سند حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے درجۂ خاص میں داخلہ لیا۔ یہ درجۂ خاص عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے مخصوص تھا، تاکہ وہ ایف اے اور بی اے کے امتحانات میں شرکت کے لیے ضروری علوم حاصل کر سکیں۔ چونکہ ندوے کے نصاب میں جدید علوم پہلے سے داخل تھے اس لیے کم سے کم مدت میں ۱۹۴۱ء میں انھوں نے بی اے کر لیا۔ اس کے بعد اسی سال ستمبر میں جامعہ کے ایک تصنیفی اور اشاعتی ادارہ مکتبہ جامعہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف میں بحیثیت انچارج میرا تقرر ہو گیا۔ اس کے بعد جامعہ کے مختلف

اداروں میں کام کرتا رہا۔ ۱۹۴۸ء میں جب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ چلے گئے تو نائب شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے شیخ الجامعہ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ ۱۹۵۵ء میں انہوں نے مجھے اپنا پرسنل مددگار مقرر کیا۔ ۱۹۷۲ء میں شیخ الجامعہ کے سکریٹری کی جگہ خالی ہوئی تو اس عہدے پر میرا تقرر ہوگیا۔ ۱۹۷۹ء تک میں اس عہدے پر کام کرتا رہا، یہانتک کہ حسب قاعدہ میں ریٹائر ہوگیا۔ شیخ الجامعہ صاحب نے بطور خاص دو ڈھائی سال کی ایک ساتھ میری خدمات میں توسیع منظور کی۔ اسی زمانے میں جب شیخ الجامعہ کے سکریٹری کی حیثیت سے میں فرائض انجام دے رہا تھا تو جناب انور جمال قدوائی صاحب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے تشریف لائے۔ ابھی تھوڑی ہی مدت میں نے قدوائی صاحب کے ساتھ کام کیا تھا کہ جامعہ کالج کے پرنسپل اور ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی ڈائرکٹر پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ تم دفتر شیخ الجامعہ میں وقت کیوں ضایع کر رہے ہو تمہاری اصل جگہ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ میں ہے۔ واقعی میرے لیے وہاں کوئی خاص کام نہیں تھا اس لیے میں خوشی سے تیار ہوگیا۔ چنانچہ ان کی کوشش سے میری خدمات ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ میں منتقل ہوگئیں اور اسسٹنٹ ایڈیٹوریل کی حیثیت سے ۱۹۷۹ء میں میں وہاں کام کرنے لگا۔ وہاں کا کام میری پسند اور ذوق کا تھا اور میرے ساتھ ضیا صاحب کا سلوک قابل تعریف تھا۔

وہ میری کتنی عزت اور کتنا احترام کرتے تھے اس کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ جب اردو میں ان کی دونوں کتابیں شایع ہوئیں تو انہیں مجھے عنایت کرتے ہوئے پہلی کتاب: شہید جستجو پر لکھا: "محب مکرم جناب عبداللطیف اعظمی کی

خدمت میں ہدیۂ مولف"۔ دستخط کے نیچے تاریخ ہے: 93-4-28۔ دوسری کتاب مولانا ابوالکلام آزاد پر لکھا: "برادر بزرگ جناب عبداللطیف اعظمی کی خدمت میں خلوص ومحبت کے جذبے کے ساتھ"۔ دستخط کے نیچے تاریخ ہے: 95-3-4۔

نیز مجھے ہر طرح کی آزادی تھی جو جامعہ کا طرۂ امتیاز ہے، جس کا میں شروع سے عادی رہا ہوں۔ صرف ایک بات سے میں پریشان تھا۔ وہ یہ کہ ماہنامہ جامعہ کی ترتیب واشاعت کی وجہ سے میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ دہلی سے باہر جا سکوں اور مختلف علمی وادبی حلقوں میں کچھ وقت گزار سکوں اور دوست احباب کی صحبتوں سے لطف اٹھا سکوں۔ نیز مجھے تصنیف وتالیف سے جو غیر معمولی دلچسپی تھی اس کے لیے ذرا بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ اس کمی کو میں اس طرح پوری کرتا تھا کہ ماہنامہ جامعہ کے خصوصی شمارے نکالتا اور ان کی زائد کاپیاں چھپواتا اور انہیں اپنے نام سے کتابی صورت میں شایع کرتا، مگر یہ بات ضیاء صاحب کو پسند نہیں تھی، لیکن میری وجہ سے خاموش رہتے۔

ایک صورت حال اور میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی۔ وہ یہ کہ قدوائی صاحب بنیادی طور پر کسی کی ملازمت میں توسیع کے سخت خلاف تھے۔ وہ کسی کو ایک دن کی بھی توسیع منظور نہ کرتے اور یہاں یہ حال تھا کہ میری سال بہ سال توسیع ہوتی رہتی تھی، میری ضرورت یا خوشنودی میں نہیں بلکہ ضیاء صاحب اپنی مجبوری میں کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ میں جو ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہوں وہ کوئی اور شخص انجام نہیں دے سکتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ شیخ الجامعہ صاحب کو وہ کیا لکھتے تھے مگر اس کا مجھے احساس تھا کہ یہ مسلسل توسیع ان کو سخت ناپسند ہے۔ اس لیے میرے اصرار پر

ضیاء صاحب نے مختلف اخبارات میں دو مرتبہ میری جگہ کے لیے اشتہارات شائع کروائے ان کے جواب میں متعدد امیدوار آئے مگر سلکشن کمیٹی میں جب انہوں نے کام کی نوعیت اور تفصیلات سنیں تو اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ضیاء صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ تم اپنی جگہ کے لیے کسی شخص کو تیار کر لو تو جا سکتے ہو۔ اتفاق سے ایک دوست نے ایک صاحب کی سفارش کی کہ میں انہیں اپنے کاموں میں شریک کر لوں۔ وہ صاحب جامعہ کے شعبہ تاریخ میں ایم اے کا امتحان دے رہے تھے نیز ان کی اردو اور فارسی کے ادب پر گہری نظر تھی۔ علاوہ ازیں کتابت و طباعت کا بھی اچھا تجربہ تھا۔ اس پر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور جونہی وہ امتحان سے فارغ ہوئے نتیجے کا انتظار کیے بغیر اپنی جگہ پر ان کا تقرر کروا کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور خوشی خوشی وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میرے اور مرحوم کے باہمی تعلقات میں ایک اہم پہلو ایسا ہے جو روا روی میں نظر انداز ہو گیا۔ وہ یہ کہ جب وہ کالج کے پرنسپل تھے اور خاکسار شیخ الجامعہ کا سکریٹری تو اکثر میں ان کے ان بلوں پر اعتراض کیا کرتا تھا جن کی ادائیگی اس بجٹ سے ہوتی تھی جو شیخ الجامعہ کے اختیار میں تھا۔ علاوہ ازیں اس زمانے میں افسران جامعہ کو سرکاری ضروریات کے لیے صرف شیخ الجامعہ کی کار تھی جو راقم الحروف کے اختیار میں تھی۔ اس کی وجہ سے بہت سے افسران جامعہ کو مجھ سے شدید شکایات تھیں۔ ان میں ضیاء الحسن فاروقی مرحوم بھی شامل تھے۔ یہ دور کتنی ابتلا و آزمائش کا تھا اس کا اندازہ آج کے زمانے میں نہیں کیا جا سکتا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب صاحب کو مجھ پر بے حد اعتماد تھا۔ اس لیے لوگوں کی شکایات کا مجھ پر کوئی

اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس کا اندازہ آپ ایک مثال سے کر سکتے ہیں۔ کار کے سلسلے میں بیگم مجیب کو بھی مجھ سے سخت شکایت تھی۔ دراصل وہ ایسی نیک اور بے ہمہ اور با ہمہ تھیں کہ انھیں کار کی چنداں ضرورت نہیں تھی مگر ان کی ایک بڑی بہن تھیں جو ان کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ وہ معمولی معمولی کام کے لیے اکثر کار کا مطالبہ کیا کرتی تھیں۔ اس طرح دوسرے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ میں حتی الوسع ٹال مٹول کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ مجیب صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کو اندازہ نہیں کہ بیگم صاحبہ سے میں آپ کی کتنی حمایت کیا کرتا ہوں۔ وہ جب بھی کار مانگیں آپ ان کو دیدیا کیجئے اور میرے نام اس کا بل بنوا دیجئے جو میری تنخواہ سے ادا ہو جائے گا۔ میں نے انتہائی ادب سے عرض کیا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کی کتنی تنخواہ ہے اور کٹ کٹا کر کتنی ملتی ہے، اگر یہ سختی میں نہ کروں تو یہ رقم بھی آپ کو نہ ملے گی۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ خود بیگم صاحبہ کو کار کی بالکل ضرورت نہیں ہوتی ورنہ میں ان کی ضروریات کو کسی نہ کسی طرح پورا کر دیتا۔ یہ دوسرے لوگ ہیں جو ان کی نیکی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس پر وہ بالکل خاموش ہو گئے۔

مذکورہ بالا تحریر کو لکھتے وقت نہ جانے کیوں اپنے وطن کے مقبول ترین اور عظیم ترین شاعر حضرت اقبال سہیل مرحوم کا حسب ذیل شعر بار بار یاد آتا رہا۔ آپ بھی سنیے!

نکہت گل کی طرح عمر بسر کی اقبال
راحت اغیار کو دی آپ پریشاں ہو کر

۲

اس مختصر گذارش کے بعد انتہائی اجمال کے ساتھ مرحوم ضیاء الحسن فاروقی صاحب کے بارے میں ان کی پرسنل فائل سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ جن کی خوبی یہ ہے

کہ یہ خود ان کے قلم کے مرہونِ منت ہیں۔ گویا ایک طرح سے ان کی حیثیت خودنوشت حالاتِ زندگی کی ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ تاریخ وار ہیں۔ ایک وضاحت اور کردوں کہ ان خطوط یا مراسلات میں شیخ الجامعہ کو ان کے عہدے کے نام سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ کسی کا نام شامل نہیں ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ جامعہ میں ان کا تقرر پروفیسر محمد مجیب مرحوم کے عہد میں ہوا تھا۔ ان کے بعد شیخ الجامعہ کی حیثیت سے پروفیسر مسعود حسین خاں تشریف لائے پھر جناب انور جمال قدوائی صاحب۔ ان ہی کے زمانے میں ضیاء صاحب ریٹائر ہوئے۔

زیر تذکرہ اقتباسات سے پہلے ضیاء صاحب مرحوم کے مختصر ترین الفاظ میں انکا سوانحی خاکہ ملاحظہ ہو:

۱۔ ۲؍ مئی ۱۹۲۵ء کو ٹانڈہ (ضلع فیض آباد۔ یو پی) میں پیدا ہوئے۔

۲۔ ۱۹۴۴ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔

۳۔ ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سیکنڈ ڈیویژن میں ایم اے کیا۔ خصوصی مضامین ڈپلومیسی اور بین الاقوامی سیاسیات تھے۔

۴۔ ۲۱؍ مئی ۱۹۵۰ء کو سہ روزہ مدینہ (بجنور۔ یو پی) کی مجلس ادارت میں شامل ہوئے اور ۲۸؍ جون ۱۹۵۳ء تک اس میں کام کیا۔

۵۔ اس کے بعد جمعیۃ علمائے ہند دہلی کی جانب سے انگریزی میں ایک ہفتہ وار اخبار دی میسیج شایع ہوا تو سہ روزہ مدینہ چھوڑ کر اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔

۶۔ اسی زمانے میں جامعہ ملیہ میں ایک جگہ نکلی تو ۲۵ جولائی ۱۹۵۳ء کو اس جگہ کے لیے شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب کو ضیاء صاحب نے لکھا: "مجھے معلوم ہوا ہے کہ جامعہ

کالج کو تاریخ و سیاسیات کے ایک استاد کی ضرورت ہے۔ میں اس جگہ کے لیے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔ تاریخ و سیاسیات میرے خاص مضمون رہے ہیں۔ شیخ الجامعہ صاحب نے موصوف کی اس درخواست کو منظور کر لیا۔

۷۔ مرحوم راک فیلر فاؤنڈیشن کناڈا میں اعلیٰ تعلیم کے لیے تشریف لے گئے۔

۸۔ ۱۲؍ نومبر ۱۹۵۹ء کو موصوف نے شیخ الجامعہ صاحب کو اطلاع کی کہ میں کناڈا میں اپنی تعلیم ختم کر کے واپس آگیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج ۲۴؍ نومبر ۱۹۵۹ء سے کالج میں اپنا کام شروع کر دوں۔ براہِ کرم مجھے اس کی اجازت دی جائے۔ حسب قاعدہ اجازت دی گئی۔

۹۔ ۲۲؍ اگست ۱۹۶۳ء کو ضیاء صاحب نے جامعہ کالج کے پرنسپل کے عہدے کے لیے درخواست دی جو منظور کر لی گئی۔

۱۰۔ ۶؍ جولائی ۱۹۷۲ء کو ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے اپنے مراسلے میں شیخ الجامعہ صاحب کو لکھا کہ: "میں نے اپنی انتظامی ذمہ داریوں کے باوجود اپنی مجوزہ کتاب: مسلم ایجوکیشنل سسٹم اِن انڈیا (بزبان انگریزی) کا مواد جمع کر لیا ہے۔ مجھے محض لکھنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کام کے لیے مجھے سب بی ٹیکل (SABBITICAL) رخصت منظور کی جائے۔ حسب قاعدہ منظور کی گئی"۔ (موصوف کی مطبوعہ کتابوں میں یا ان کے مسودات میں اس کتاب کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اعظمی)۔

۱۱۔ یکم جولائی ۱۹۸۵ء کو فاروقی صاحب ریٹائر ہو گئے۔ مگر ری اپلائنٹمنٹ کے تحت تین سال کی مدتِ ملازمت میں مزید اضافہ ہوا۔

۱۲۔ ۲۷؍ ستمبر ۱۹۸۸ء کو میں نے اپنی آنکھوں کی بینائی کی کمزوری اور موتیابند

کی وجہ سے آنکھوں کے آپریشن کے سلسلے میں آپ سے گفتگو کی تھی اور یہ عرض کیا تھا کہ مجھے یکم نومبر ۱۹۸۸ء سے ذاکر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی اعزازی ڈائرکٹری اور ماہنامہ جامعہ۔ اسلام اور عصر جدید' اور 'اسلام اینڈ دی موڈرن ایج' کی ایڈیٹری کی خدمت سے سبکدوش فرمایا جائے۔ آپ نے میری معذوری کے پیش نظر میری اس تجویز سے اتفاق فرمایا تھا۔ شیخ الجامعہ صاحب نے موصوف کی جمع شدہ رخصت استحقاقی ۲۸ یوم کے ساتھ موصوف کو سبکدوش فرمایا۔

۱۳۔ مرحوم کی چھوٹی موٹی کتابوں کی تعداد ویسے تو بہت سی ہیں مگر ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ مضمون کی ہے۔ اردو میں ان کی اہم کتابیں صرف دو ہیں۔ پہلی شہید جستجو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جو حجم اور معیار دونوں لحاظ سے ان چند کتابوں میں سے ہے جو آزادی کے بعد کی مطبوعات میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مطبوعہ اگست ۱۹۸۸ء۔ حجم ۶۰۷ صفحات۔ اس کو لکھ کر مرحوم نے اپنی مطبوعات کی کمی کی تلافی کر دی۔ دوسری مولانا ابوالکلام آزاد۔ فکر و نظر کی چند جہتیں۔ یہ مختلف مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ مطبوعہ: دسمبر ۱۹۹۴ء۔ حجم ۱۵۵ صفحات۔ انگریزی میں میری معلومات کے مطابق مرحوم کی دو کتابیں ہیں، پہلی: "دی دیوبند اسکول اینڈ دی ڈیمانڈ فار پاکستان"۔ مطبوعہ: ۱۹۶۳ء۔ کتابی سائز پر حجم صرف ۱۴۵ صفحات۔ دوسری حضرت نظام الدین اولیاء کے مشہور ملفوظات: فوائد الفواد کا انگریزی ترجمہ جسے موصوف نے اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد ترجمہ کیا اور شایع کر دایا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح حیات پر انگریزی میں ایک کتاب اپنی وفات سے پہلے موصوف نے مکمل کر لی تھی۔ جو ان کے ارشاد کے مطابق اس وقت ناشر کے

پاس ہے جو امید ہے کہ انشاء اللہ جلد چھپ جائے گی۔ چونکہ مولانا ابوالکلام آزاد ہم دونوں کے مشترک موضوع ہیں اس لیے وہ اکثر مجھ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ان کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ مولانائے مرحوم پر اب تک برصغیر ہند و پاک میں جتنی کتابیں شایع ہوئی ہیں یہ کتاب ان میں سب سے بہتر ہوگی۔

اولاد کے لحاظ سے بھی مرحوم بڑے خوش قسمت تھے۔ کل چار اولادیں۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔ خدا کے فضل سے سب کی سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ انکی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ ڈاکٹر عماد الحسن آزاد فاروقی۔ جامعہ اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر ڈاکٹر حسین انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی ڈائرکٹر اور ماہنامہ جامعہ کے علاوہ ان تمام رسائل کے مدیر جن کے ان کے والد مرحوم تھے۔

۲۔ ڈاکٹر علاء الحسن آباد۔ سائنٹسٹ سنٹر انسٹی ٹیوٹ آف میڈیسن اینڈ اسٹمیک پلانٹ۔ لکھنؤ۔

۳۔ ڈاکٹر مسز عطیہ روحی۔ بی۔ یو۔ ایم۔ الیس علیگ۔ مقیم چاندپور (یوپی)

۴۔ ڈاکٹر مسز عارفہ عرفی علیگ۔ گولڈ میڈلسٹ۔ مقیم فیض آباد (یوپی)

علامہ سید سلیمان ندویؒ سمینار

از عمیر الصدیق دریابادی ندوی

گذشتہ دنوں ۲۸ / نومبر سے یکم دسمبر ۱۹۹۶ء تک حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی حیات و خدمات کی یاد میں جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ میں ایک اہم اور وقیع سمینار منعقد ہوا، اس سے پہلے ہندوستان میں اسی موضوع پر چار اہم سمینار پٹنہ، علی گڈھ، دہلی اور بھوپال میں ہو چکے تھے لیکن علوم اسلامیہ کی مملکت سلیمانی کا پایہ تخت اعظم گڈھ اس شرف سے اب تک محروم تھا، یہ سعادت سید صاحب کے ایک شاگرد اور فیض یافتہ مولانا محمد مجیب اللہ ندوی ناظم جامعۃ الرشاد کے حصہ میں آئی۔

اعظم گڈھ کے دینی، علمی اور ادبی قدردانوں کے لئے ان چار دنوں کی بہار کی یاد عرصہ تک باقی رہے گی۔ سید صاحب کی کشش نے دور دراز سے اہل علم و قلم کو اعظم گڈھ کی اس دور افتادہ سرزمین پر جمع کر دیا، ان میں سر فہرست مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات گرامی ہے، ان کی رفاقت میں مولانا محمد رابع ندوی، مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی مولانا واضح رشید ندوی وغیرہ کے علاوہ مصر کے نامور محقق و مورخ اور ادیب ڈاکٹر عبدالحلیم عویس بھی تشریف لائے، مولانا مدظلہ اور ان کے رفقائے گرامی نے دو روز قیام کیا اور ازراہ محبت و عنایت دارالمصنفین کے مہمان خانہ کو رونق بخشی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے سمینار کا افتتاح کیا اور عربی زبان میں سید صاحب کے متعلق ایک نہایت مفید قیمتی مقالہ بھی پیش کیا، لیکن اس سمینار کی خاص وجہ کشش اور اس کی کامیابی کی ضمانت، سید صاحبؒ کے خلف الرشید اور صوری و اخلاقی محاسن میں ان کا مثنیٰ اور الولد سر لابیہ کے مصداق ڈاکٹر محمد سلمان ندوی رہے، وہ جنوبی افریقہ سے ۲۶ نومبر کو ہی اعظم گڈھ تشریف لے آئے اور اپنے قیام کے لئے دارالمصنفین کے اسی احاطہ کو پسند کیا جس کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ سے ان کے عہد طفلی و عنفوان شباب کی ناقابل فراموش یادیں وابستہ ہیں، اس سے پہلے وہ اسلام اور مستشرقین کے سمینار میں شرکت کی غرض سے ۱۹۸۲ء میں آئے تھے۔ قریب ۱۴ سال کے بعد وہ اپنے گھر پھر واپس آئے اور خدا کا شکر ہے کہ خود کو مانند مہمان لے کر نہیں آئے، ان کی محبت، سادگی، خلوص، بے تکلفی اور دلنوازی کی ادائیں ہر دل پر نقش ہو گئیں، ان کے علاوہ علی گڈھ سے حبیب شبلی و سلیمان کے نبیرہ

ارجمند جناب پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی نے بھی اپنی شرکت سے سمینار کو عزت بخشی اور دارالمصنفین میں قیام کیا۔ مندوبین کی تعداد بھی خاصی رہی، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی اسی مدہ،، انجمن ترقی اردو ہند، جامعہ عثمانیہ، خدا بخش لائبریری پٹنہ، امارت شرعیہ، دارالتصنیف والترجمہ بھوپال، دارالقضاء بھوپال، مرکز الدعوۃ الادب الاسلامیہ خیر العلوم سدھارتھ نگر، اودھ یونیورسٹی فیض آباد، رانچی یونیورسٹی۔ .... جامعۃ الفلاح بلریا گنج کی عمدہ اور منتخب نمائندگی ہوئی، دہلی سے پروفیسر نثار احمد فاروقی اور جناب خلیق انجم اور روزنامہ قومی آواز دہلی کے جناب منصور آغا بھی تشریف لائے، خدا بخش لائبریری پٹنہ کے جناب حبیب الرحمن چغانی نے بھی ایک نشست کی صدارت کی اور پروفیسر یسین مظہر صدیقی ندوی اور ان کے رفقائے علی گڈھ فعال، متحرک اور سمینار کی جان بنے رہے۔ جامعۃ الرشاد، دارالمصنفین اور دارالعلوم ندوۃ العلماء تو گویا میزبان ہی تھے۔ اخیر دو دنوں میں امارت شرعیہ اور ملی کونسل کے امین عام مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کی شرکت سے سمینار کے وزن و وقار میں اضافہ ہوا، اس مختصر روداد میں تمام مندوبین اور ان کے مقالات کا ذکر نہیں کیا جا سکتا، انشاء اللہ جامعۃ الرشاد سے مفصل روداد شایع ہوگی تو سب کا ذکر آئے گا، اس چار روزہ سمینار میں روزانہ دو طویل نشستیں ہوتی رہیں، جن میں سید صاحب کی جامع کمالات شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی جن میں تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، تصوف، تحقیق، تنقید، زبان، شعر و ادب، مکتوب و تعزیت نگاری، معاصرین سے تعلقات، سیاسی خیالات، تصانیف و مقالات اور سید صاحب کی سیرت و سوانح کے مختلف حصوں کو واضح کیا گیا۔ افتتاحی خطبہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے سید صاحب کی کثرت مطالعہ، عقیدہ اہل سنت والجماعت پر استقامت، رسوخ فی العلم اور تنوع کی جن خصوصیات کا ذکر کیا تھا، سمینار میں گویا ان کا بالاستیعاب مطالعہ پیش کیا گیا۔ مولانا مجیب اللہ ندوی کے جذبات تشکر اور دعا کے ساتھ اس بزم سلیمانی کا اختتام ہوا۔ آخر میں بعض تجاویز بھی منظور کی گئیں، جن میں سید صاحب کی تصانیف خصوصاً سیرۃ النبیؐ کی از سر نو مراجعت کے لئے مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کی سربراہی میں محققین کی ایک کمیٹی کی تشکیل کی تجویز بھی تھی۔ مہمانوں کی ضیافت اور ان کے آرام کا جامعۃ الرشاد نے عمدہ انتظام کیا، دارالمصنفین نے بھی ایک عشائیہ پر مندوبین کو مدعو کیا اور اسی موقع پر سید صاحب کی تصنیفات، مسودات، خطوط و دستاویزات اور سید صاحب کے متعلق کتابیات اور تصاویر پر مشتمل ایک نمائش کا اہتمام بھی کیا۔

اخبار علمیہ

کلکتہ کی ایران سوسائٹی کا نام ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی خدمت اور اس کے تحفظ و بقا میں نمایاں ہے، اس کی بعض سرگرمیوں کا ذکر پہلے بھی ان صفحات میں آچکا ہے، ۱۹۴۴ء میں جب بنگال کے فارسی کے مشہور فاضل و محقق ڈاکٹر محمد اسحاق مرحوم نے اسے قائم کیا تھا تو ہندوستان میں فارسی زبان کی بتدریج کم ہوتی ہوئی اہمیت اور حکومت و عوام کی بے اعتنائی کی وجہ سے امید کم تھی کہ اس ادارہ کی مدت حیات دراز ہوگی، لیکن یہ اس کے مخلص [illegible] بانی کی پاک نیت، کوشش پیہم اور عزم بالجزم کی برکت ہے کہ نامساعد اور ناموافق حالات کے باوجود سوسائٹی نے پچاس برس پورے کرلیے اور اس عرصہ میں اہم کتابوں، وقیع خطبات اور مذاکروں اور اپنے موقر سہ ماہی مجلہ انڈو ایرانیکا کے ذریعہ اس نے فارسی زبان و ادب کی لائق تحسین خدمت کی، امیر خسرو حسن دہلوی، فیضی، بیدل، غالب اور اقبال نے ہندوستان کی بزم فارسی میں جو شمعیں روشن کی تھیں، ایران سوسائٹی نے ان کی ضیاپاشی میں اضافہ ہی کیا، چنانچہ رودکی، البیرونی، فیضی، صادق اصفہانی، کاہی اور اقبال کے علاوہ اور موضوعات پر اس نے فارسی اور انگریزی میں بلند پایہ کتابیں شایع کیں، یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے، پروفیسر عطا کریم برق کی ایک اہم کتاب جلد ہی شایع ہورہی ہے جس کا موضوع 'بنگالی زبان و ادب پر فارسی کا اثر' ہے۔ سوسائٹی کا کتب خانہ بھی فارسی زبان کے طلبہ و محققین

کے لیے بڑا کارآمد ہے، اس میں تقریباً دس ہزار کتابیں ہیں، سوسائٹی کے جشن پنجاہ سالہ کے موقع پر اس کے رسالہ انڈو ایرانیکا نے ایک خاص نمبر شایع کیا ہے۔ اس میں ہندوستان و ایران کے ممتاز فضلا کے قلم سے اعلیٰ درجہ کے مضامین ہیں، دارالمصنفین اور سوسائٹی کے درمیان رشتۂ علمی ہمیشہ استوار رہا، سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم تو گویا اس کے سرپرستوں میں تھے، سوسائٹی کے ایک تاسیسی رکن پروفیسر محب الحسن کی کتاب کشمیر انڈر دی سلطانس شایع ہوئی تو دارالمصنفین نے اس کا اردو ترجمہ کشمیر سلاطین کے عہد میں شایع کیا، سوسائٹی کے روح رواں اور سابق صدر جسٹس خواجہ محمد یوسف دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے معزز رکن ہیں، قدرتاً ہم اس پچاس سالہ جشن اور انڈو ایرانیکا کی اشاعت خصوصی سے مسرور اور سوسائٹی کی بقائے دوام کے لیے دست بدعا ہیں۔

پاکستان میں ایک مفید علمی ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز قریب اٹھارہ سال سے قائم ہے، اس کا مقصد قومی اور بین الاقوامی سطح پر منصوبہ بند بحث و تحقیق کو فروغ دینا ہے، حال ہی میں اس کا دو ورقی انگریزی خبرنامہ موصول ہوا تو معلوم ہوا کہ اس مختصر مدت میں اس نے ۱۳۶ کتابوں کے علاوہ ماہانہ، دوماہی اور سہ ماہی مجلوں کی اشاعت کا اہتمام کیا، ان رسائل میں 'عالم اسلام اور مسیحیت' 'وسطی ایشیا کا مسلمان' 'دینی صحافت' 'کشمیر واچ' 'پاکستان پولیٹیکل پرسپکٹیو' اور 'قضایا دولیہ' شامل ہیں جو اردو، عربی اور انگریزی میں شایع ہوتے ہیں، بعض جدید مطبوعات مثلاً ترقیاتی پالیسی کی اسلامی تشکیل، بنک کا سود اور اسلامائزیشن آف لا اینڈ اکانومی کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی، چنانچہ یہ اور بعض دیگر مطبوعات جیسے منی اینڈ

بینکنگ ان اسلام، بوسنیا کے مسلمان، حرمت ربوا، غیر سودی مالیاتی نظام اور اسلامی
ریاست میں نظام تعلیم وغیرہ اب طبع جدید کے مراحل میں ہیں۔

طباعت و اشاعت کے میدان میں ایک اور کارنامہ کی خبر آئی ہے، لندن سے
فن تعمیر بلکہ تمام فنون جمیلہ پر محیط ایک جدید ڈکشنری آف آرٹ طبع ہوئی ہے یہ چھتیس
ضخیم جلدوں میں ہے اور گو اس اعتراف کے ساتھ ہے کہ ان فنون میں یہ حرف آخر
نہیں ہے تاہم یہ اپنے موضوع پر بجا طور پر سب سے جامع و حاوی کہلانے کی
مستحق ہے اس کے ناشر میک ملن اور مرتب جین شواف ٹرنر ہیں جن کا کہنا ہے کہ
اس کی تیاری میں وقت اور زر کثیر ضرور صرف ہوا یعنی ۱۴ سال اور ۱۵ ملین ڈالر،
لیکن یہ اسی شان کی ہوئی بھی، دراصل یہ دنیا کے چند عظیم ترین اشاعتی منصوبوں میں
ایک تھی، اس میں کل ۳۸۸،۳۰ صفحات ہیں، اشاریہ کے ۱۸۰،۱ صفحات مزید ہیں،
اشاریہ دو جلدوں میں ہے۔ ۴۱۰۹ ڈالر کی خطیر رقم اس کی قیمت ہے، ظاہر ہے یہ
عام گھروں کی الماریوں کی زینت مشکل سے بن سکتی ہے، لیکن چھ ہزار کی تعداد میں
شائع ہونے والی یہ قاموس یا موسوعہ نصف سے زائد یونیورسٹیوں اور میوزیم کے
ہاتھوں فروخت ہو چکی ہے، ناشر سے جب یہ سوال کیا گیا کہ جب اس کی تکمیل میں
۱۴ سال صرف ہوئے اور رقم کی بازیافت میں مزید ۱۱ برس کا انتظار کرنا ہوگا تو
اس منصوبہ میں رقم لگانے والے حصص داروں کا رد عمل کیا ہے تو انہوں نے
امید ظاہر کی کہ ۲۰۰۰ء تک وہ اس صرفہ کی تلافی کر لیں گے۔ درحقیقت ایسے عظیم الشان
منصوبہ کو ان کے جیسا پرائیویٹ ادارہ ہی پایہ تکمیل کو پہنچا سکتا تھا۔

عالمی پیمانہ پر کتابوں کی خبروں میں گذشتہ دنوں یہ خبر بھی نمایاں رہی کہ بازار

چین میں اس وقت "چائنا کین سے نو" نامی کتاب سب سے زیادہ فروخت ہونے
والی کتاب رہی اصلاً یہ امریکا مخالف جذبات کی عکاسی ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ
اس سے پہلے جاپان سے بھی اسی نام کے ساتھ صرف چین کے بجائے جاپان کے تغیر
سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جو جاپان کی سب سے کثیر الاشاعت کتاب ثابت ہوئی
چینی کتاب کو پانچ چینی صحافیوں اور شاعروں نے تیار کیا ہے، اس کا پہلا اڈیشن
پچاس ہزار کی تعداد میں طبع ہوا اور صرف چند ہفتوں میں یہ فروخت ہو گیا کتاب
کے ایک مولف سانگ کیانگ نے بتایا کہ امریکا چین کو صرف اس لیے برباد کرنے
کے درپے ہے کہ کہیں وہ اقتصادی لحاظ سے برتر طاقت نہ بن جائے، کتاب میں امریکا
کے ارادوں اور نیت سے آگاہ کیا گیا ہے کہ امریکا، چین مخالف ممالک کے ذریعہ
چین کے خلاف ایک حصار قائم کرنا چاہتا ہے اور وہ اس کے اقتصادی استحکام
کو کمزور و کمتر ثابت کرنے میں کوشاں ہے، اس کے لیے امریکا نے چینی نوجوانوں میں
آزادانہ جنسی اختلاط کو خاص طور پر ہوا دی ہے۔

طباعت کا کاروبار اب عالمی سطح پر ایک سود مند بازار تجارت میں بدل گیا ہے،
لیکن ہندوستان میں اس کی صورت حال اب بھی مختلف ہے جہاں مسودات کی بڑی مختصر
تعداد ہی ناشرین کی نگاہ میں بار پاتی ہے، چنانچہ اب یہ سوال شد و مد کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ
آخر دوسرے مسودات کا کیا حشر ہوتا ہے اور وجہ ترجیح کیا ہے عمدگی یا محض قابل فروخت ہونا؟
روزنامہ پانیر نے اس مسئلہ پر ایک دلچسپ رپورٹ پیش کی ہے جو گو انگریزی مطبوعات تک محدود
ہے لیکن دوسری زبانوں کو بھی اسی آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے اور ہندوستانی مصنفین کی اس
شکایت کی تصدیق ہوتی ہے کہ طباعت کے مراحل تک مسودہ کا سفر انتہائی دشوار گزار ہے ناشرین کے
معیار و قبولیت کا کوئی متعین پیمانہ نہیں ہے حالت یہ ہے کہ مشہور ناشر ادارہ پینگوئن کو دو سو مسودات موصول ہوئے

ان میں قابل اشاعت صرف ایک سمجھا گیا اور ایک دائرہ دیا، موصول ہونے والے مسودات میں صرف پندرہ فیصد کو لایق غور سمجھتا ہے، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے ایک فرد اسنے کہا کہ ایسا کیوں نہ ہو نشر و اشاعت اب مقامی معاملہ نہیں رہا اب غیر محدود ہے، اس سلسلہ میں بعض مصنفین کا تجربہ جدا جدا ہے، ایک مصنفہ گیتا ہری ہرن کی پہلی کتاب تھاؤزنڈ فیسز آف نائٹس، پندرہ سال کے بعد شایع ہوئی انکا کہنا ہے کہ واقعی پندرہ سال پہلے حالات زیادہ دشوار تھے مگر گذشتہ دس برس میں فضا خاصی بدلی ہے، اسکی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اب ناشرین کی تعداد بھی زیادہ ہوئی ہے، چنانچہ ایسے اہل قلم جو عموماً خشک و بے کشش موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں انکے لیے بھی اب یہ راہیں کھلی ہیں، مقبول صحافیہ انیس جنگ کہتی ہیں کہ میری کتابیں مقبول ہیں انکی اشاعت میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی لیکن غیر معروف اہل قلم کے لیے کتابوں کی اشاعت اب بھی جوئے شیر لانے کے مرادف ہے، انکی نگاہ میں ہندوستانی ناشرین موثر ترتیب و پیشکش میں بھی قاصر ہیں، انکی نظر صرف آمدنی پر رہتی ہے اسی وجہ سے اکثر غیر معیاری اور معمولی درجہ کی کتابیں جلد شایع ہو جاتی ہیں حالانکہ تصنیف و تالیف کو محض شغلہ سود و زیاں نہیں بنایا جا سکتا۔ ایک وجہ اور بھی ہے مغربی ممالک کے برخلاف ہندوستان میں ادبی ایجنٹوں کی روایت نہیں ہے۔ اس دلچسپ روداد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ آسانی سے شایع ہونے والی کتابیں نصابی ہیں، شاعری اس کے برعکس ہے، افسانہ و ناول کچھ عرصہ پہلے زیادہ مقبول نہیں تھے مگر اب ان کی اشاعت میں اچھا خاصا اضافہ ہوا ہے۔ اس تمام روداد کا خوشگوار پہلو یہ ہے کہ اب ہندوستانی کتابیں بیرون ملک بھی مقبول ہونے لگی ہیں، اس کے نتیجہ میں اہل قلم کے لیے اب مستقبل یقیناً خوش آیند ہے، لیکن یہ سوال اب بھی قایم ہے کہ مصنف کی بیش قیمت تحریر کو قابل رد قرار دینے والا ناشرین کا رویہ آخر کب ختم ہوگا؟۔

ع۔ ص۔

آثار علمیہ و تاریخیہ

مکاتیب علامہ سید سلیمان ندویؒ

بنام

صوبیدار حافظ جلیل صاحب بھوپالی [1]

بھوپال

عزیز مکرم شفاکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کا خط پاکر اور آپ کے سواد خط کو دیکھ کر دل سے خوشی ہوئی، آنے جانے والوں سے برابر آپ کا حال دریافت کرتا رہتا ہوں اور آپ کے لیے دعائے خیر کرتا ہوں۔

بحمد اللہ، میں اچھا ہوں، آشوب چشم میں آپ کے سامنے سے مبتلا ہوں گو پہلے سے اچھا ہوں، مگر ابھی صحت کلی نہیں ہوئی ہے۔ علاج جاری ہے۔

خوشی ہوئی کہ آپ کی عام صحت اچھی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ باقی آلام و تکالیف بھی دور ہوں۔ میرا مقصد یہی تھا کہ ۲۳ ستمبر کو بھوپال سے چل کر ۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کراچی سے حجاز کو روانہ ہوں، لیکن دہلی کی راہ غیر مامون اور کراچی کی راہ بند ہو جانے

[1] صوبیدار حافظ جلیل صاحب بھوپال کے رہنے والے اور ندوہ کے عاشقوں میں تھے ان کے لڑکے افتخار جلیل ندوہ میں زیر تعلیم تھے۔ ان کے نام کے یہ خطوط حضرت سید صاحبؒ کے فرزند ڈاکٹر سلمان ندوی نے مرحمت فرمائے ہیں جن کو ان کے شکریے کے ساتھ شایع کیا جا رہا ہے۔

کے سبب سے ڈر ہے کہ امسال بھی محروم نہ رہنا پڑے۔

یہ آپ کی محبت ہے جو عالم رویا میں میری تصویر آپ کے سامنے کر دیتی ہے، اسکے لیے یہ فقیر آپ کا ممنون ہے، میری اور آپ کی محبت خالص خدا کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول کریں اور ہم دونوں کو ایک دوسرے سے فائدہ پہونچائیں۔

تین ماہ کی مزید مدت بھی انشاء اللہ تعالیٰ بخیریت تمام ہوگی اور آپ کو بہمہ وجوہ صحت نصیب ہو، آپ کے لیے یہ خوشخبری ہوگی کہ ماشاء اللہ مولوی عمران خاں صاحب کی تحریک سے یہاں کی تبلیغی جماعت کام کر رہی ہے، آج بھی تین دن کے لیے جماعت باہر گئی ہوئی ہے۔

درس قرآن شریف بحمد اللہ جاری ہے، آج سورۂ ہود ختم ہوئی، اب سورۂ یوسف شروع ہوگی۔ والسلام

ہیچمداں۔ سلیمان

۱۸ر ستمبر ۱۹۴۷ء

بھوپال

محبی و مکرمی عجل اللہ تعالیٰ شفائکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ، الحمد للہ خیریت ہے، میں دو ہفتوں کے لیے لکھنؤ، اعظم گڈھ، پٹنہ، رانچی کے سفر پر تھا، اب چند روز ہوئے کہ واپس آیا، آپ کا لفافہ جانے سے پہلے ہی مل گیا تھا، عزیزی افتخار کی درخواست دفتر میں دیدی، آپ کی خیریت اور سوانح بمبئی سے اطلاع ہوئی، معلوم نہیں کہ اب کیا صورت حال ہے اور یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ اندر گئے یا بمبئی ہی ہیں اور انجکشن ہوئے بھی یا نہیں اور ان کا کیا اثر ہوا،

الحمد للہ کہ روزے اور تراویح بخیر و خوبی انجام پا رہی ہیں، اب آپ جلد اچھے ہوجائیں تو ایک تراویح آپ کے پیچھے پڑھوں۔ بیچارے مولوی عزیز الرحمٰن[1] کی بیٹھ پر کاربنکل نکل آیا ہے۔ ابھی تک تو عطائی علاج ہوتا رہا، کل رات اسپتال داخل کیے گئے۔ حضرت پیر صاحب[2] مدظلہ بہت کچھ بیمارداری فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ صحت بخشے۔

میاں سلمان[3] بخیر ہیں ان کی طرف سے سلام قبول کیجئے۔ والسلام

سید سلیمان

۲۶ر رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ[4]

بھوپال

مکرم عجل اللہ تعالیٰ شفائکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ، محبت نامہ ملا، تفصیلی حالات معلوم ہوئے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلیں حل فرمائیں اور جلد صحت بخشیں[5]۔

حج کے لیے وسط ستمبر میں بمبئی کا قصد ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔ خدا جانے اس وقت تک آپ کہاں رہیں۔

روزہ اور تراویح کے فوت ہونے پر آپ کو جو رنج اور افسوس ہے انشاء اللہ تعالیٰ اللہ پاک اس کا بھی اجر آپ کو ادا کریں گے، سلمان میاں کی طرف سے سلام قبول کیجیے،

---

[1] مولانا عزیز الرحمٰن بھوپال میں جامعہ احمدیہ میں ادب کے استاد تھے [2] حضرت شاہ یعقوب مجددی۔
[3] حضرت سید صاحب کے فرزند اصغر، ڈاکٹر سید سلمان ندوی پروفیسر ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ۔
[4] مطابق ۲۲ جولائی ۱۹۴۷ء [5] حافظ صاحب ایک حادثہ میں پیروں سے معذور ہو گئے تھے بیساکھی پر چلتے تھے، بمبئی میں زیر علاج تھے۔

آج کل درس میں ۲۹ پارہ ہو رہا ہے، حافظ عمران خاں صاحب اپنی تبلیغ میں لگے ہوئے ہیں۔

کل ان کی جماعت کا سیہور میں بڑا اجتماع تھا۔ والسلام

سید سلیمان

۲۷ رمضان المبارک ۱۹۴۸ء[1]

بھوپال

محب مکرم عجل اللہ شفائکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، یادآوری کا شکریہ۔ آپ کے پہلے خط کا جواب نہ دے سکا، جس کا افسوس ہے، آپ کا خواب رویائے صادقہ تھا، اللہ تعالیٰ مزید صحت عنایت فرمائے۔ میں تو امسال بھی محروم رہا میرا نواسہ[2] حج میں اپنے والدین کے ساتھ جا رہا تھا عین وقت پر مبتلا ہو گیا جس کی وجہ سے ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

الحمد للہ تعالیٰ خیریت ہے آپ کی خیریت کا داعی اور طالب، اب تو یہاں ڈاکٹر مولا بخش سیول سرجن ہو کر آگئے ہیں جو آپ کے پہلے معالج تھے۔

آپ کے لڑکے کے لیے دارالعلوم ندوہ میں تعلیم کی شرط کے ساتھ وظیفہ ۲۵ کی عبید اللہ اسکالرشپ سے کوشش کی ہے مگر قدوس صہبائی صاحب نے اس کو پسند نہیں کیا۔ اس لیے مجبوری ہے۔ اب مقامی وظیفہ کی کوشش کرونگا۔

انشاء اللہ عنایت اپنی مزید خیریت سے مطلع فرمائیے اور میرے لیے دعا کیجئے، مریض کی دعا قبول ہوتی ہے۔ والسلام

سید سلیمان : ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء

۱؎ یہ یقیناً سہو قلم ہے، صحیح ۱۹۴۹ء ہوگا۔ ۲؎ نواسہ سے مراد بڑے نواسے سید حسن ہیں جو اب کراچی میں ہیں۔ یہ دوسرے داماد سید حسین صاحب کے لڑکے ہیں۔ سید حسین صاحب کا انتقال علیگڑھ میں ۱۹۸۶ء میں ہوا، وہ I.A.S. تھے، کمشنر ہو کر ریٹائر ہوئے۔ ۳؎ افتی و خلیل کے داخلہ کے لیے۔ وہ اب کراچی میں ہیں اور شاعر بھی ہیں، اشوق تخلص کرتے ہیں۔

مطبوعات جدیدہ

رسالوں کے خاص نمبر

ماہنامہ اوراق (خاص نمبر) مرتبین: جناب وزیر آغا و سجاد نقوی، متوسط سے قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کتابت و طباعت، صفحات ۴۰۴، قیمت ۸۰/ روپے، سالانہ ۱۵۰/ روپے پتہ: دفتر اوراق ۱۱۵/۳ سرور روڈ، لاہور چھاؤنی، پاکستان۔

پاکستان کا رسالہ اوراق اپنے اعلیٰ ادبی و تنقیدی و شعری معیار اور فاضل نقاد ڈاکٹر وزیر آغا کی ادارتی صلاحیت کی وجہ سے اردو دنیا میں بڑی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، گذشتہ دنوں جولائی اور اگست ۹۶ء کے شماروں پر مشتمل اس کا خاص شمارہ موصول ہوا، مضامین کی کثرت و تنوع کی وجہ سے یہ بھی اپنی شہرت کے عین مطابق ہے۔ اس کا بڑا حصہ شعری کاوشوں پر مشتمل ہے، جس میں حمد و نعت و سلام اور غزل کے علاوہ گیت، دوہے اور ہائیکو بھی شامل ہیں، ہائیکو کی صنف اب اردو شاعری میں اجنبی نہیں، لیکن بعض ماہیے اور ڈھولنے بھی اس شمارہ میں بڑے دلکش اور پر لطف نظر آئے، ماہیے عموماً ہندوستان کے ادبی رسائل میں کم شائع ہوتے ہیں، ان کی ایک مثال ملاحظہ ہو، کچھ سپنے سلونے تھے، جھولی میں بچپن کی، کچھ ریت کھلونے تھے / گفتار زمانے کی، دل پہ گری جیسے، تلوار زمانے کی / بارود پہ بیٹھی ہے، میرے زمانے کی، یہ فاختہ کیسی ہے / ڈھولنے کی صنف میں بھی ایک کشش ہے۔ حصہ نثر میں افسانے، انشائیے، نثر لطیف، خاکے، مقالات، مطالعے اور تبصرے وغیرہ ہیں، دو شاعروں نصیر احمد ناصر اور حامد جیلانی کے شعری انتخاب کے ساتھ ان کا تجزیاتی مطالعہ بھی ہے۔ ان دونوں کی شاعری کی طرح ان کا تجزیہ بھی موجودہ جدیدیت کے اسلوب و طرز نگارش کا آئینہ ہے، مثلاً "ان نظموں میں مشاہدہ تجربہ موضوعیت معروضیت، مکانیت، لامکانیت، زمانیت، لازمانیت، تشبیہات، استعارات، علامتیں، سمبلز سبھی نظر آتے ہیں" اسی قسم کا ایک مضمون گوپی چند نارنگ کی ادبی نظریہ سازی

بھی ہے جس میں یہی مافوق الطبیعاتی اسلوب نمایاں ہے، بین تہذیبی اور بین ادبی تو پھر قابل فہم تعبیریں ہیں لیکن بین جمالیاتی عوامی، بین قدر سنجی، بین امتزاجیت پسندی کون صفات سی ہیں جو اردو ادب کی جدید شعریات کے لئے منبع نور قرار دی گئی ہیں، اس پس منظر میں فاضل مرتب کی اداراتی تحریر معنی خیز اور فکر انگیز ہے، انھوں نے بڑے سلیقہ سے لکھا کہ "مغرب کی فکری اور ادبی تحریکوں سے اردو والوں کو آشنا کرنا بھی ایک اہم خدمت ہے، مگر ان افکار میں اور تحریکوں کے بہاؤ میں بے دست و پا ہوجانا کوئی اچھی بات نہیں.... .. ہم نے تاحال زیادہ تر ایسے شمع برداروں ہی کو سامنے لانے کا اہتمام کیا ہے جن کا کام مغربی نظریات کے بارے میں معلومات مہیا کرنے تک محدود تھا، فرق وہی ہے جو چراغ جلانے اور جلتے ہوئے چراغ کو لانے میں ہے" مقالات میں بعض تحریریں مثلاً اردو کے ہائیکو نگار اور سرائیکی زبان کے ماخذ پر از معلومات ہیں، اردو ادب کی تازہ ترین پیش رفت سے واقف ہونے کے لئے یہ خاص نمبر معلومات افزا ہے۔

رضا لائبریری جرنل (شمارہ ۲) مرتبین: پروفیسر نثار احمد فاروقی، جناب وقار الحسن صدیقی، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۳۱۴، قیمت درج نہیں، پتہ: رام پور رضا لائبریری حامد منزل، رام پور، یوپی۔ ۲۴۴۹۰۱۔

رامپور کی رضا لائبریری کے علمی ترجمان کا یہ دوسرا شمارہ ہے، پہلا شمارہ چھ سال پہلے شائع ہوا تھا، اس طرح یہ شمارہ ثانی گویا نشاۃ ثانیہ کی علامت ہے اور اپنے بلند پایہ مضامین اور حسن سلیقہ کے باعث بجا طور پر بہتر ہے۔ کل ۲۸ مقالات و مضامین میں خاصا حصہ رامپور کے تعلق سے ہے، مثلاً علم تفسیر اور علوم شرعیہ کے فروغ میں رامپور کا حصہ، رامپور کا فن تعمیر، وغیرہ، دوسرے مقالات میں پروفیسر گیان چند، پروفیسر مختار الدین احمد اور ڈاکٹر شفیع شیخ کی تحریریں ڈاکٹر اشپرنگر بحیثیت محقق، المقریزی کی ایک غیر مطبوعہ نادر تصنیف اور اردو زبان پر عربی کے اثرات، تصرف ہیئتی کی روشنی میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، خواجہ حسن ثانی نظامی کا مضمون صوفیوں اور ہندوستانی تہذیب پر ان کے اثرات کے متعلق بہت پر لطف و دلچسپ ہے، ایک اور مستحسن کوشش ڈاکٹر شعائر اللہ خاں کی تیار کردہ فہرست ہے جو رضا لائبریری کے اردو مخطوطات پر مشتمل ہے، قریب ۱۳۵۶ مخطوطات کا یہ اشاریہ محققین اور اسکالروں کے لئے حد درجہ مفید ثابت ہوسکتا ہے، امید ہے کہ مزید توجہ و نگرانی

سے اس مجلہ کا آئندہ ہر نقش تابندہ تر ہوگا۔

سہ روزہ دعوت (خصوصی اشاعتیں، معاشرت اور عالمی مذاہب) مرتبہ: جناب پرواز رحمانی، بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۱۴، ۱۱۴، قیمت ۱۵ - ۱۵/ روپئے، پتہ: دفتر دعوت، دعوت نگر، ابو الفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۱۰۰۲۵۔

اردو اخبارات میں سہ روزہ دعوت، بامقصد صحافت، سنجیدہ فکر، خبروں کے انتخاب اور اندیشہ سود و زیاں سے بے نیازی کی خصوصیات کا حامل ہے، بعض اہم عصری مسائل پر وہ وقتاً فوقتاً خصوصی شمارے بھی شائع کرتا ہے۔ زیر نظر دونوں خصوصی شمارے اسی سلسلہ کی کڑی ہیں، معاشرت ۲۸/ مارچ ۹۶ء کی خاص اشاعت ہے۔ اس میں مستند قدیم و جدید معلومات کی مدد سے ہندوستان کے مختلف فرقوں کی معاشرتی زندگی کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ جن میں اسلام کا طرز معاشرت بھی شامل ہے، مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف فرقے اور طبقات، ایک دوسرے کی معاشرتی زندگی اور اس کے حسن و قبح سے واقف و متعارف ہوں، دوسری خاص اشاعت ۲۸/ نومبر ۹۲ کی ہے اور عالمی مذاہب سے ہے، اس میں معاشرت کی طرح مختلف عالمی مذاہب کا تعارف و تقابل ہے، اس میں بابل و مصر کے عقائد و مذہبی روایات، یہود و نصاریٰ و مجوس کے علاوہ ہندوستانی مذاہب بھی ہیں، بہائیت، سکھ مت اور قادیانیت بھی ان میں شامل ہیں، یہ دونوں شمارے ہر طبقہ کے لئے یکساں کارآمد اور لائق غور و فکر ہیں۔

ماہنامہ سب رس (خصوصی اشاعت) مرتب: جناب مغنی تبسم، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت مناسب، صفحات ۱۳۶، قیمت ۲۵/ روپئے پتہ: ادارہ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ، حیدرآباد، اے پی۔

حیدرآباد دکن کے ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان رسالہ سب رس محتاج تعارف نہیں، خصوصاً حیدرآباد مرحوم کی شاندار تاریخ، زبان، تہذیب و ثقافت اور اس کی پاکیزہ روایات کی یاد اور اس کے تحفظ و بقا کے لئے یہ رسالہ و ادارہ پیہم کوشاں ہے، اس سے پہلے اس کا ایک خاص نمبر دکنی کلچر کے موضوع پر شائع ہوکر مقبول ہو چکا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے یوم محمد قلی قطب شاہ کا اہتمام کیا، اس موقع پر ایک سمینار میں قطب شاہی سلاطین کے کارناموں پر پرمغز مضامین پیش کئے گئے۔ زیر نظر شمارہ میں جو مئی جون ۹۶ء کی مشترکہ اشاعت ہے، ان مضامین کو اس ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے کہ ان سلاطین کے تمام

کارناموں کی ایک جامع جھلک سامنے آگئی ہے اور ان سے قطب شاہی فرمانرواؤں کی تہذیب و تمدن، ان کے عہد کے ارباب کمال و اہل فن، نظام حکومت و عدل، ایران و دکن کے خصوصی روابط اور ان کے اخلاق و عادات کی بڑی دلکش تصویر سامنے آتی ہے، عربی و فارسی زبان و ادب کی حوصلہ افزائی کے علاوہ مقامی تلگو زبان سے ان بادشاہوں کی محبت کی داستان بھی پڑھنے کے لائق ہے، بجا طور پر یہ شمارہ اپنے موضوع پر دستاویزی حیثیت کا حامل ہے، کمپیوٹر کی کتابت البتہ ناقص اور بعض جگہ تکلیف دہ ہو گئی ہے، آغا حیدر حسن مرزا کے مضمون قطب شاہی تہذیب و تمدن کا لطف اسی وجہ سے جاتا رہا۔

ماہنامہ دار العلوم (وفیات نمبر) مرتبہ: جناب مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۲۸۸، قیمت ۱۰/ روپئے سالانہ ۶۰ روپئے پتہ: دفتر ماہنامہ دار العلوم، دیوبند، سہارنپور، یوپی۔

دار العلوم دیوبند کے ترجمان رسالہ دار العلوم میں بزرگان دین و مشاہیر ملت کی رحلت و وفات پر تعزیتی مضامین کا بھی ایک حصہ شامل ہوتا ہے، اپریل تا جولائی ۹۶ء کے اس مشترک شمارہ میں ایسی پینتالیس تحریروں کو جمع کر دیا گیا ہے جو گذشتہ بارہ سال میں شائع ہوتی رہی ہیں، ان میں علماء و فضلاء، صوفیہ و اساتذہ اور ارباب قلم و سیاست کا صرف ماتم ہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت اور اہم کارناموں کا مختصر خاکہ بھی آگیا ہے، حلقہ و طبقہ کے فرق کے باوجود ان مرحومین کے اعتراف و ستائش میں وسعت قلب اور توازن و اعتدال ہے، زیادہ تر مضامین فاضل مرتب کے قلم سے ہی ہیں، البتہ ترتیب و تدوین مزید توجہ کی متقاضی ہے، بار بار یاد رفتگاں اور وفیات کی سرخی کی ضرورت نہیں تھی، اسی طرح ہر مضمون نئے صفحہ سے شروع کیا جانا بہتر ہوتا، کتابت کی غلطیاں بھی ہیں، زبان کی بعض فروگذاشتیں بھی توجہ کے قابل ہیں، جیسے ایک ایک ارکان، قحط انسانیت عام انحطاط کے دور میں؟ بسط و روابط، دیگر فنونات وغیرہ، مولانا ضمیر احمد اعظمی کے ذکر میں ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ "علم حدیث کی منتہی کتابیں بنگال اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں پڑھائیں" یہاں بنگال کے مدرسہ کا ذکر بھی ہونا چاہئے تھا۔ مدرسۃ الاصلاح سے ان کے تعلق کا علم نہیں۔

ع۔ ص

دار المصنفین کی اہم ادبی کتابیں

شعر العجم حصہ اول: (علامہ شبلی نعمانی) فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا عہد بعہد ترقی اور اس کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور عباس مروزی سے نظامی تک کے تمام شعرا کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۔۴۰روپے

شعر العجم حصہ دوم: شعرائے متوسطین خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ و ابن یمین تک کا تذکرہ مع تنقید کلام۔ قیمت ۔۳۵روپے

شعر العجم حصہ سوم: شعرائے متاخرین فغانی سے ابوطالب کلیم تک کا تذکرہ مع تنقید کلام۔ قیمت ۔۳۵روپے

شعر العجم حصہ چہارم: ایران کی آب و ہوا، تمدن اور دیگر اسباب کے شاعری پر اثرات و تغیرات دکھانے کے علاوہ تمام انواع شاعری میں سے مثنوی پر بسیط تبصرہ۔ قیمت ۔۳۵روپے

شعر العجم حصہ پنجم: قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ۔ قیمت ۔۳۰روپے

انتخابات شبلی: شعر العجم اور موازنہ کا انتخاب جس میں کلام کے حسن و قبح، عیب و ہنر، شعر کی حقیقت اور اصول تنقید کی تشریح کی گئی ہے۔ قیمت ۔۲۵روپے

کلیات شبلی (اردو): مولانا شبلی کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی قصائد اور تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں شامل ہیں۔ قیمت ۔۲۵روپے

گل رعنا: (مولانا عبد الحئی مرحوم) اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد اردو شعرا (ولی سے حالی و اکبر تک) کا حال اور آب حیات کی غلطیوں کی تصحیح، شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا بصیرت افروز مقدمہ۔ قیمت ۔۶۰روپے

نقوش سلیمانی: مولانا سید سلیمان ندوی کے مقدمات، خطبات اور ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں اردو کے مولد کی تعیین کی کوشش کی گئی ہے۔ قیمت ۔۶۰روپے

شعر الہند حصہ اول: (مولانا عبد السلام ندوی) قدما کے دور سے جدید دور تک اردو شاعری کے تاریخی تغیر و انقلاب کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ

شعر الہند حصہ دوم: (مولانا عبد السلام ندوی) اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید۔ قیمت ۔۵۰روپے

اقبال کامل: (مولانا عبد السلام ندوی) ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح حیات، فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل، ان کی اردو و فارسی شاعری کی ادبی خوبیاں اور ان کے اہم موضوعات فلسفہ خودی و بیخودی نظریہ ملت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف (عورت) فنون لطیفہ اور نظام اخلاق کی تشریح۔ قیمت ۔۴۰روپے

اردو غزل: (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) اردو غزل کی خصوصیات و محاسن اور ابتدا سے موجودہ دور تک کے معروف غزل گو شعرا کی غزلوں کا انتخاب۔ قیمت ۔۷۵روپے